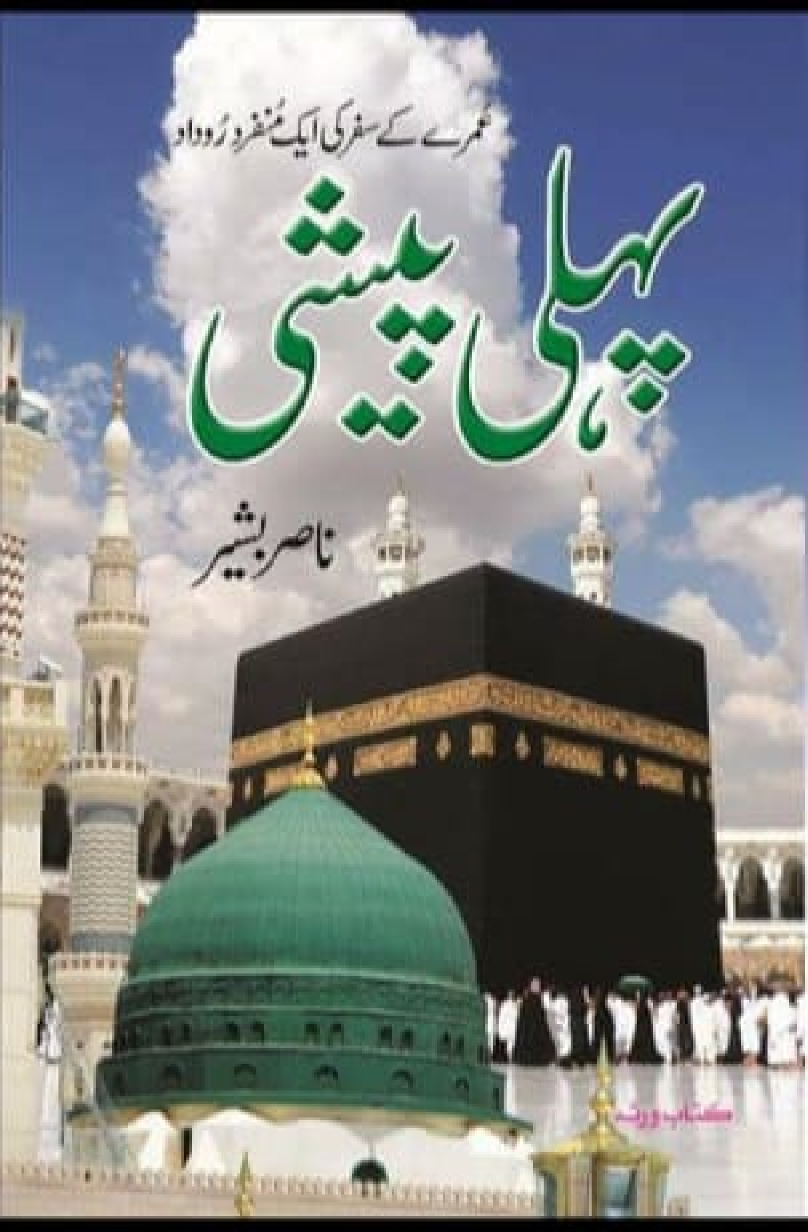


عمرے کے سفر کی ایک منفرد روداد

پہلی پیشی

ناصر بشیر

کتاب ورثہ

پہلی پیشی

ناصر بشیر

کتاب ورثہ



پہلی پیشی

یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ناصر بشیر زیادہ اچھے شاعر ہیں یا نثر نگار...... غزل میں تو انہوں نے اپنا لوہا منوا ہی لیا تھا، نظم میں انہوں نے مولانا ظفر علی خان کی پیروی کر کے دکھا دی ہے۔ حالاتِ حاضرہ پر روزانہ نظم لکھتے اور روزنامہ "پاکستان" کے قارئین سے داد پاتے ہیں۔ وہ مشکل سے مشکل زمین میں بڑی آسانی اور روانی کے ساتھ شعر کہہ سکتے ہیں۔ انہوں نے دو برس پہلے رمضان المبارک کے مہینے میں ہر روز نعت لکھ کر دربارِ رسالت مآب ﷺ میں حاضری کی سعادت حاصل کی اور پھر عمرے کا سفر ایک نئے جذبے اور شوق سے لکھ ڈالا۔

اس سفرنامے کی ایک ایک سطر اور ایک ایک لفظ سے گواہی ملتی ہے کہ یہ ایک مقدس سفر کی کوئی روایتی روداد ہرگز نہیں ہے۔ اسے بجا طور پر ایک زندہ اور شگفتہ روداد کہا جا سکتا ہے جو پڑھنے والوں کو اپنی طرف کھینچتی اور ان کے دلوں میں وہ آتشِ شوق بھڑکا دیتی ہے، جو دیارِ رسول ﷺ میں پہنچ کر ہی سرد ہو سکتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ جس طرح ان کے نعتیہ اشعار بارگاہِ رسالت ﷺ میں باریاب ہوئے تھے، ان کی یہ نثری نعت بھی شرفِ قبول حاصل کرے گی اور ان کے لیے دنیا و آخرت میں آسودگی کا سامان فراہم ہو گا۔

مجیب الرحمٰن شامی

30/06/2016



For Book Lovers
Kitab Virsa
Ghazni Street, Urdu Bazar Lahore
www.kitabvirsa.com
kitabvirsa@gmail.com - 0333-4377794

عمرے کے سفر کی ایک منفرد رُوداد

پہلی پیشی

ناصر بشیر

کتاب وِرثہ

غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

kitabvirsa@gmail.com

کتاب سے محبت کرنے والوں کے لیے

ہماری کتابیں، معیاری کتابیں

اہتمام اشاعت

مظہر سلیم مجوکہ

ضابطہ

پہلی اشاعت : رمضان المبارک 1437ھ/ جولائی 2016

دوسری اشاعت: رمضان المبارک 1439ھ/ جون 2018ء

نام کتاب : پہلی پیشی (عمرے کے سفر کی ایک منفرد رُوداد)

صاحبِ کتاب : ناصر بشیر 0333-4339350
nasirbashir1968@gmail.com

ناشر : کتاب وِرثہ

غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور 0333-4377794

مطبع : حاجی حنیف اینڈ سنز، لاور

قیمت : -/400 روپے

”پہلی پیشی“ کا پہلا باب

لکھنے کی سعادت

مجھے

خانہ کعبہ اور حجرِ اسود

کے سامنے بیٹھ کر حاصل ہوئی

ع کہاں میں کہاں یہ مقام اللہ اللہ!

ناصر بشیر

&

پہلی پیشی

ناصر بشیر

انتساب

جناب

مجیب الرحمان شامی

کے نام

فہرست

دیکھے ہوئے اک خواب کی تعبیر ملی ہے

پہلی پیشی

یہ جولائی 2014ء کی بات ہے۔رمضان کے آخری عشرے کے آخری دن تھے۔ میں عیدالفطر منانے کیلئے لاہور سے اپنے والدین کے پاس گیا ہوا تھا، ایک روز حسب عادت اپنی والدہ کے قدموں میں لیٹا ہوا تھا کہ میرے موبائل فون پر ایک اجنبی نمبر نمودار ہوا۔اس نمبر سے یہ معلوم کرنا بھی مشکل تھا کہ یہ کس ملک کے کس شہر سے آیا ہے؟ پہلے تو دل میں کئی وسوسے پیدا ہوئے لیکن ہمت کر کے میں نے کال او کے کرلی۔دوسری طرف سے ایک بہت ہی زیادہ مانوس آواز آئی۔

''ناصر بشیر صاحب! امریکا سے مجیب الرحمٰن شامی بول رہا ہوں۔کیا حال ہے؟ خیریت سے ہیں آپ؟'' جب میں نے اثبات میں جواب دیا تو شامی صاحب بولے: ''کیا آج کل آپ عمرہ کرنے کے لیے سعودی عرب میں ہیں؟''

نہیں سر! میں تو اس وقت ملتان میں اپنی والدہ کے قدموں میں بیٹھا ہوں۔'' میں نے کہا۔پھر میں نے دل میں سوچا کہ والدین کی خدمت میں مؤدب ہو کر حاضر رہنا بھی تو ایک عبادت ہے۔پھر میں نے پوچھا: ''سر! یہ خیال آپ کے دل میں کس طرح پیدا ہوا کہ میں عمرہ کرنے آیا ہوا ہوں؟ بولے: ''ان دنوں روزنامہ ''پاکستان'' میں ہر روز چھپنے والی آپ کی تازہ نعتیں پڑھ کر مجھے گمان گزرا کہ شاید آپ عمرہ کرنے گئے ہوئے ہیں۔بہر حال میں عیدالفطر کے دو چار دن کے بعد پاکستان واپس آ رہا ہوں اور آپ عمرے پر جانے کے لئے تیار رہیں۔'' یہ کہ کر انھوں نے فون بند کر دیا۔میں نے یہ خوش خبری سب سے پہلے اپنی والدہ محترمہ کو سنائی۔انھوں نے سنتے ہی خوشی کا اظہار کیا۔والد صاحب کو بتایا تو وہ بھی مسرور ہوئے۔میرا تو آپ کچھ مت پوچھیے کہ کیا حال ہوا۔جب میں نے شبنم کو یہ خبر دی تو اس نے کہا: ''میں بھی ساتھ جاؤں گی۔'' مجھے لگا کہ اس کے لہجے میں اس میں تیقن بھی ہے اور درخواست بھی۔اس کی بات سن کر میں چپ رہا۔پھر مجھے گورنمنٹ دیال سنگھ کالج لاہور کے شعبہ اردو کے سربراہ اور اپنے رفیق کار ظفر چشتی صاحب کی بات یاد آ گئی۔انھوں نے ایک ماہ پہلے کالج کے اسٹاف روم میں بہت سے دوستوں کے روبرو کہا تھا: ''ناصر بشیر: تمھاری منظوری ہو چکی ہے،تم جلد ہی خانہ خدا میں حاضری دو گے۔تمھارا بلاوا آنے ہی والا ہے۔'' میں چپ رہا لیکن وہاں موجود ایک اور دوست نے پوچھا: ''چشتی صاحب! اتنے یقین سے آپ نے اتنی بڑی بات کس طرح کہ دی؟'' بولے: ''ناصر بشیر کی تازہ نعتیں پڑھ لو۔ان میں مدینے جانے کی تڑپ صاف نظر آتی ہے اور یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ مدینے والے تک تڑپ کی یہ لہر نہ پہنچی ہو۔اب وہی ناصر بشیر کو بلائیں گے۔چھیڑ چھاڑ کرنے والے ممتاز نعیم نے کہا: ''اور اگر اس سے پہلے ناصر بشیر کو مکے والے نے بلا لیا تو کیا ہوگا؟'' ایک اجتماعی قہقہہ بلند ہوا اور محفل برخاست ہو گئی۔

گھر پہنچا تو میں نے اپنی ساری تازہ نعتیں اپنے سامنے پھیلا کر رکھ لیں۔ میں نے ساری دوبارہ پڑھیں۔ایک نعت پر آ کر میری آنکھیں جم گئیں۔

مدینے جا کے انھیں حال دل سناؤں گا
جو مجھ پہ ہجر میں گزری ہے، سب بتاؤں گا
ہمیشہ گنبدِ خضرا کا خواب دیکھا ہے
وہاں سے خواب کی تعبیر لے کے آؤں گا
وہ خاکِ طیبہ جہاں آپؐ کے ہیں نقشِ قدم
میں اپنی آنکھ کے موتی وہاں گراؤں گا
مجھے بھی لوگ کہیں گے گدائے شہرِ نبیؐ
درِ رسول پہ کشکول لے کے جاؤں گا
میں دل کو کھول کے رکھ دوں گا، روبرو ان کے
تڑپ تڑپ کے میں رووں گا، گڑگڑاؤں گا
کہوں گا روز وہاں جا کے ایک نعت نئی
پھر ان کے در پہ کھڑا ہو کے میں سناؤں گا
انھی کے دم سے یہاں سربلند ہوں ناصر
مدینے جا کے میں یہ سر نہیں اٹھاؤں گا

غلامی میں بادشاہت

میرا ایمان ہے کہ شاہؐ دو جہاں اپنی ساری رعایا پر نظر رکھتے ہیں، وہ جسے چاہتے ہیں، اپنے پاس بلاتے ہیں، اس کے آنسو پونچھتے ہیں، تھپکی دیتے ہیں، پیار کرتے ہیں، اس کی

سنتے ہیں، میں نے چشمِ تخیل سے دیکھا کہ حضورؐ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہایت بلند تخت پر جلوہ گر ہیں اور ان کے سامنے لاکھوں کروڑوں مجھ ایسے گنہگار کھڑے ہیں۔ اچانک انھوں نے میری طرف دیکھا، میرے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ بس پھر کیا تھا؟ میں ہجوم کو چیرتے ہوا آگے بڑھا اور جا کر انؐ کے قدموں میں گر گیا، انھوں نے فرمایا: ”مجھے اپنی کہی ہوئی نعت سناؤ“ میں نے تعمیل کی اور پوری نعت سنا دی، اردگرد کھڑے سارے لوگ مجھے رشک سے دیکھ رہے تھے، اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے ایک غلام کو بادشاہت مل گئی ہے، ان کی غلامی بادشاہت ہی تو ہے۔

مبارک ہو!

جب میں نے اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کو بتایا کہ میں جلد ہی عمرہ کرنے کے لیے روانہ ہونے والا ہوں تو مبارک بادوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا، میں سوچ رہا تھا کہ روانہ ہونے سے پہلے ہی اتنی مبارکبادیں مل رہی ہیں تو واپسی پر کیا حال ہوگا؟ اکثر دوستوں نے یہی کہا کہ تمھارا بلاوا آ گیا ہے۔ وہاں صرف قسمت والے لوگ جاتے ہیں۔ تم خوش قسمت ہو کہ جوانی ہی میں حرمین شریفین کی زیارت کرنے جا رہے ہو۔ پتا نہیں لوگ مجھے ابھی تک جوان کیوں سمجھتے ہیں؟ شاید میں دیکھنے میں جوان لگتا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اندر سے ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ میں ہمیشہ خود سے بڑے لوگوں کی صحبت میں بیٹھتا رہا ہوں۔ بوڑھوں کو دیکھ کر، ان کی باتیں سن کر، ان کا ہم سفر ہو کر خوش ہوتا ہوں، میرے استاد ڈاکٹر ریاض مجید صاحب نے ایک بار کہا تھا: ”ناصر بشیر کے اندر ایک بوڑھی روح ہے۔“

میرے اندر ایک بوڑھی روح چاہے موجود ہو لیکن سچ یہ ہے کہ میرا عشق آج بھی

جوان ہے۔خدا سے خدا کے محبوبؐ سے،خدا کی مخلوق سے اور تخلیق مجھے ہمیشہ عشق رہا ہے اور رہے گا۔عشق کا یہ سرچشمہ مجھے انسانیت کے قریب رکھتا ہے:

آپؐ کے عشق نے انسان بنایا ہے مجھے
اب میں اپنا نہیں اوروں کا بھلا چاہتا ہوں

بلاوا نہیں پیشی

جب میرے دوست مجھے کہتے کہ وہاں سے تمھارا بلاوا اس لیے آیا ہے کہ تم ایک اچھے انسان ہو تو میں جھینپ جاتا اور کہتا: ”وہاں سے نیک لوگوں کو کم ہی بلاوا آتا ہے۔ وہاں صرف وہ بلائے جاتے ہیں جن کے گناہ زیادہ ہو جاتے ہیں۔وہاں سب سے بڑی عدالت لگتی ہے جو ملزموں کو سمن جاری کرتی ہے،ان کے آنے جانے، رہنے اور کھانے پینے کا بندوبست کرتی ہے اور پیشی کے لیے ایک دن مقرر کرتی ہے۔ہر ملزم کو اسی دن وہاں حاضر ہونا پڑتا ہے۔اس عدالت کے اپنے قاعدے اور ضابطے ہیں۔جو ان قاعدوں اور ضابطوں پر عمل کرتے ہوئے عدالت میں پیش ہوتا ہے، وہ بری ہو کر واپس آتا ہے۔

مجھے بھی یوں لگ رہا تھا جیسے مجھے عدالت میں پیشی کا حکم ملا ہے۔یہ عدالت چونکہ ہمیشہ عدل کرتی ہے، اس لیے مجھے یقین تھا کہ میں وہاں سے بری ہو کر آؤں گا۔پاک صاف ہو کر آؤں گا،ایک زیرو میٹر گاڑی کی طرح۔اللہ تعالیٰ جب انسان کو دنیا میں بھیجتا ہے تو وہ بالکل زیرو میٹر ہوتا ہے، مجھے یقین تھا کہ عمرہ ادا کرنے کے بعد میں پھر سے زیرو میٹر ہو جاؤں گا،سفر نئے سرے سے شروع کروں گا۔خدا سے،خدا کے محبوبؐ سے خدا کی مخلوق سے اور تخلیق سے ایسا عشق کروں گا جس میں لالچ اور دکھاوا نہیں ہو گا۔میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ سب سے بڑی عدالت صرف گناہ گاروں کو طلب کرتی ہے،اور انھیں اپنی صفائی کا

موقع دے کر ان کے دل کی بات سن کر،انھیں بری کر دیتی ہے۔

فارغ البالی کے دن

انھی دنوں مجھے خیال آیا کہ عمرہ ادا کرنے کے بعد مجھے سر کے بال اتروانا ہوں گے، ”فارغ البال“ ہونا ہو گا تو کیوں نہ ابھی سے یہ کام کر لیا جائے، چنانچہ میں سنت نگر میں سرور نائی کے پاس جا پہنچا۔سرور نائی روایتی نائی ہے جو اپنے نام کے ساتھ آج بھی نائی لکھتا ہے، اس کی تین بائی تین کی چھوٹی سی دکان میں بڑے بڑے لوگ آتے رہے ہیں۔بقول سرور نائی کے حبیب جالب اس کا پکا گاہک تھا۔اب اس کی دکان میں بڑے لوگوں کی آمد و رفت ختم ہو گئی ہے، ہاں مجھ ایسے لوگ بہت آتے ہیں، جو اس کی ٹوٹی پھوٹی پرانی کرسی پر گردن اکڑا کر بیٹھتے ہیں اور وہ ان کے سروں پر اپنے بوڑھے ہاتھوں سے ذرا سا دباؤ ڈال کر انھیں سر جھکانے پر مجبور کر دیتا ہے۔سرور نائی میں بہت سی خوبیاں ہیں۔پورے لاہور میں وہ سب سے کم مزدوری لیتا ہے۔اس نے اپنی مزدوری ایک پینٹر سے روغنی رنگوں سے لکھوا کر کرسی کے سامنے لٹکا رکھی ہے۔گاہک غریب ہو یا امیر وہ سب سے برابر کا سلوک کرتا ہے۔بخشش بھی نہیں لیتا، حجامت کرتے ہوئے اس کی زبان،اس کی قینچی کا پورا پورا ساتھ دیتی ہے۔دونوں کی ایک ہی رفتار ہوتی ہے۔میں چونکہ اس کے پاس ٹنڈ کرانے گیا تھا،اس لیے قینچی سے تو بچ گیا لیکن اس کی زبان سے محفوظ نہیں رہ سکا۔بہت سے پرانے قصے سنے۔تب کہیں جا کر میری ٹنڈ ہوئی۔

عمرہ کر کے آئے ہو؟

جب مجھے فارغ البالی کا شوق چرایا تھا تب شدید سردی کے دن تھے،اس لیے میرے سارے دوست مجھے دیکھ کر حیران ہوتے تھے اور بیش تر پوچھتے تھے کہ تم عمرہ ادا کر کے آئے

ہو کیا؟ میں کہتا: نہیں، میں پوری سردی سرورنائی سے ٹنڈ کراتا رہا۔اس کی باتیں سنتا رہا اور عمرے سے متعلق لوگوں کے سوال کا جواب نفی میں دیتا رہا۔ایک دن ''روزنامہ پاکستان'' میں میرے رفیق کار ارشد صاحب نے پوچھا: ''ناصر صاحب! آپ نے اتنی شدید سردی میں ٹنڈ کیوں کرائی ہے، مجھے اصل وجہ بتائیں؟''

میں نے کہا: ''بات یہ ہے کہ میں ایک گناہ گار آدمی ہوں۔ مجھے حرمین شریفین جاتے ہوئے شرم آ رہی ہے۔ میں دل ہی دل میں سوچتا ہوں کہ مجھ ایسا خطا کار بھی وہاں جا رہا ہے۔اب جب لوگ میری ٹنڈ دیکھ کر پوچھتے ہیں کہ کیا عمرہ کر کے آئے ہو تو میں نفی میں جواب دیتا ہوں۔میرا جواب سن کر لوگ اطمینان کا سانس لیتے ہیں۔اب تک مجھ سے سینکڑوں لوگ یہ سوال پوچھ چکے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ میں جب عمرہ ادا کرنے کے بعد لاہور آؤں تو کوئی مجھ سے یہ سوال نہ پوچھے، میں دراصل اپنی عبادت کو اپنے لیے تفاخر کا باعث نہیں بنانا چاہتا تھا۔

یہ کون ہیں جو مرا ہاتھ تھامنے آئے؟

کسے وکیل کریں؟

پیشی چونکہ بڑی عدالت میں تھی، لہٰذا وکیل کی تلاش شروع ہوئی۔ میں دوستوں کی کسی بھی محفل میں جاتا تو باتوں باتوں میں ان سے کوئی کام کی بات اگلوانے کی کوشش کرتا بالکل اسی طرح جیسے ہم کسی دفتر میں کام نکلوانے جائیں تو دوستوں سے پوچھ لیتے ہیں کہ وہاں تمھاری کسی سے جان پہچان ہے؟ اپنے دوست حکیم سلیم اختر کی بیٹی کی رخصتی کی تقریب میں گیا تو میرے ساتھ توقیر احمد شریفی بیٹھے تھے۔ میں نے یہاں بھی جان پہچان والا قصہ چھیڑ دیا۔شریفی صاحب بولے: ''سعودی عرب روانہ ہونے سے پہلے آپ مجھے بتا دیجیے گا اور جاتے ہوئے اپنا فون نمبر دیتے جایئے گا'' شریفی صاحب بھلے مانس آدمی ہیں۔ پیشے کے لحاظ سے انجینئر ہیں۔سعودی عرب کی ایک پاور کمپنی میں جنرل منیجر ہیں لیکن دفتر ان کا لاہور

کے علاقے شادمان میں ہے۔ شعر کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں، انھیں شاعری کرتے ہوئے ایک مدت گزر گئی ہے لیکن ان کے ساتھ وہی ہوا ہے جو بنک کے باہر بل جمع کرانے والے لوگوں کی لمبی لائن سے نکل جانے والے شخص کے ساتھ ہوتا ہے۔ یعنی انھیں نئے سرے سے لائن میں لگنا پڑ گیا ہے۔ اپنی عمر خیالات اور حرکات و سکنات سے بزرگ لگتے ہیں لیکن بہت سے نوجوان اور نوآموز شاعر، قطار میں ان سے آگے کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔

اُنھی دنوں شامی صاحب کی ہمشیرہ کا انتقال ہو گیا قل خوانی کی تقریب میں گیا تو وہاں شامی صاحب کے بھانجے اور رنام ور ہنکار جناب شہزاد احمد شامی سے ملاقات ہوئی۔ وہ چونکہ روزنامہ ''پاکستان'' میں چھپنے والی میری شاعری پڑھتے ہیں، اس لیے نہایت پرتپاک انداز سے ملے۔ جب میں نے انھیں بتایا کہ شامی صاحب مجھے عمرے پر بھیج رہے ہیں تو بولے: ''جانے سے پہلے مجھے بتا دیجیے گا۔ میں وہاں آپ کے رہنے کا کوئی مناسب بندوبست کر دوں گا۔''

سب سے بڑی عدالت میں پیشی کے لیے مجھے کوئی وکیل تو نہیں مل سکا لیکن اجنبی ملک میں راہ نمائی کرنے والے کئی لوگ مل گئے تھے۔ اب میں مطمئن تھا کہ حجازِ مقدس میں اکیلا نہیں ہوں گا، میں دعا مانگوں گا تو کئی ہاتھ میرے ہمراہ دعا مانگنے کے لیے اٹھیں گے۔

آنسوؤں کی کہانی

پیشی مجھ گناہ گار کی تھی لیکن شبنم چاہتی تھی کہ وہ بھی اس سفر میں میرے ہمراہ چلے۔ شبنم میرے ساتھ ہر وقت ہر جگہ جانے کو تیار رہتی ہے۔ اس سفر میں اس نے میرے کہے بغیر خود ہی ساتھ جانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ میرا دل بھی چاہتا تھا کہ اس مقدس سفر میں وہ

میرے ساتھ چلے لیکن دل کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ (ویسے یہاں یہ بات بتانے میں کوئی حرج نہیں کہ وہ مجھے دل کہہ کر پکارتی ہے) دل چونکہ جیب کے نیچے ہوتا ہے اس لیے دل کا کوئی بھی کام جیب کے بغیر نہیں ہوتا۔ ایک دن روزنامہ ''پاکستان'' کے دفتر پہنچا تو شامی صاحب سے ملاقات ہو گئی، ان کے سامنے شبنم کی خواہش رکھی تو بولے: ''ٹھیک ہے میں دو ٹکٹیں لے دوں گا۔'' گھر جا کر بتایا تو وہ بہت خوش ہوئی میں سوچنے لگا کہ دل کی بات تو پوری ہو گئی لیکن جیب کا بوجھ بڑھ گیا ہے۔ شبنم نے اپنی بہنوں، سہیلیوں اور ہمسائیوں سب کو اپنے عمرے پر جانے کی خبر سنا دی۔ اب میری طرح وہ بھی مبارک بادیں وصول کر رہی تھی۔ چند روز کے بعد میں شامی صاحب کے پاس پہنچا۔ عرض کیا: ''خالی ٹکٹوں سے میرا کام نہیں چلے گا۔'' بولے: ''پھر اکیلے چلے جاؤ۔ سارے اخراجات میں اٹھا لوں گا۔'' میں نے کہا: ''ٹھیک ہے۔'' اپنی اس خودغرضی پر میں دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہا تھا۔ گھر پہنچ کر شبنم کو بتایا کہ تمھاری منظوری نہیں ملی، تو وہ میرے پاس سے اٹھ کر چلی گئی۔ میں سمجھا کہ کچن میں گئی ہو گی، میں کچن میں گیا تو وہ وہاں نہ تھی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ چھت پر کپڑے سکھانے یا اتارنے گئی ہو گی، چنانچہ میں چھت پر چلا گیا، دیکھا تو وہ ایک کونے میں بیٹھی رو رہی ہے۔ میں سمجھ گیا کہ اصل بات کیا ہے؟ وہ رو کر اپنے رب سے حاضری کی اجازت طلب کر رہی تھی۔ ماں بھی بچے کو تبھی دودھ دیتی ہے جب وہ روتا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ شبنم کے آنسو رنگ لائیں گے۔ ویسے بھی آنسو کسی کے ہوں، رائگاں نہیں جاتے۔۔

مری کہانی تری کہانی سے مختلف ہے
کہ جیسے آنکھوں کا پانی، پانی سے مختلف ہے

اگلے روز میں اپنا اصل شناختی کارڈ، پاسپورٹ اور چار تصویریں شامی صاحب کے پرنسپل اسٹاف افسر فاروق صاحب کے حوالے کر آیا۔

آنسو رائگاں نہیں گئے

ویسے تو خالق کے سامنے ہر آدمی کو اکیلے ہی پیش ہونا ہے۔صرف اس کے اعمال اس کے ساتھ جائیں گے،لیکن خدا کے گھر میں حاضری دینے والوں کو بہت سی رعایتیں حاصل ہیں۔سب سے بڑی رعایت تو یہ ہے کہ آپ کسی کو اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں۔میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں کھانا بنا سکتا ہوں نہ کپڑے استری کرسکتا ہوں۔حتیٰ کہ رومال تک دھونے سے قاصر ہوں۔شبنم اب میرے بچوں کی ماں ہی نہیں،میری ضرورت بھی ہے۔اس کے بغیر میری زندگی،زندگی نہیں رہتی۔اسے دیکھ کر مجھے کسی شاعر کا یہ مصرع اکثر یاد آتا ہے:

خود بناتا ہے جہاں میں آدمی اپنی جگہ

اُس نے میرے سارے کام اپنے ذمے یوں لیے ہیں کہ میں اپنا کوئی بھی کام خود نہیں کرسکتا۔

اس واقعے کے اگلے روز شامی صاحب کے پرنسپل اسٹاف افسر فاروق صاحب کا فون آیا۔بولے:''ناصر صاحب!اپنی بیگم صاحبہ کا اصل شناختی کارڈ،پاسپورٹ اور چار تصویریں بھی مجھے دے جائیں۔''آنسو کام آ گئے تھے۔میں نے مطلوبہ چیزیں اٹھائیں اور فاروق صاحب کے حوالے کر آیا۔لیکن یہ بات میں نے شبنم سے چھپائے رکھی۔ سوچا کہ جب ہم دونوں کے پاسپورٹوں پر ویزا لگ کر آ جائے گا تب اسے بتاؤں گا۔گویا اسے میں نے رونے کے لیے چھوڑ دیا۔

اعزاز سید صاحب کا کمال

تین چار دن گزرے تو میں اپنے دوست حسیب پاشا کے پاس ان کے دفتر میں بیٹھا تھا۔پاشا صاحب ڈی جی پی آر میں ڈپٹی ڈائریکٹر ہیں لیکن ان کی اصل پہچان پی ٹی وی کا مشہور ڈراما ''عینک والا جن'' ہے جس میں انھوں نے ہامون جادوگر کا کردار ادا کیا تھا۔اے حمید کے لکھے ہوئے اس ڈرامے کے پروڈیوسر حفیظ طاہر تھے۔ان دنوں حسیب پاشا 'زکوٹا جن' یعنی منا لاہوری کے ساتھ مل کر ہر اتوار کو الحمرا ہال میں ڈراما ''جن اور جادوگر'' اسٹیج پر پیش کرتے ہیں۔یہ ڈراما لاہور آرٹس کونسل کے تعاون سے مفت دکھایا جاتا ہے۔یہ ڈراما بچوں،بڑوں اور عورتوں میں یکساں مقبول ہے۔پاشا صاحب اپنے جادوئی کرتبوں سے بچوں کو ہنساتے ہیں۔ڈرامے کے آخر میں پرسوز دعا مانگتے ہوئے خود بھی روتے ہیں اور بچوں کے ساتھ آئے ہوئے ماں باپ کو بھی رُلاتے ہیں۔میں ان کی دعوت پر یہ ڈراما کئی دفعہ دیکھ چکا ہوں۔

اس روز ان سے عمرے کے سفر کے بارے میں بات چیت ہو رہی تھی کہ میرے فون پر ایک بے نام نمبر سے کال آئی۔میں نے او کے کی تو دوسری طرف سے آواز آئی:''ناصر بشیر صاحب!کیا حال ہے؟اس وقت میرے سامنے آپ کی تصویر پڑی ہے۔آپ پہلے سے خاصے صحت مند دکھائی دے رہے ہیں۔''میں حیران تھا کہ یہ کون صاحب ہیں جو خواہ مخواہ اتنے فری ہو رہے ہیں۔میں سمجھا کہ ان کے سامنے کوئی اخبار پڑا ہوگا جس میں میری تصویر چھپی ہوگی۔اس لیے پوچھا:''کون سا اخبار ہے جناب آپ کے سامنے؟'' بولے:''میرے سامنے اس وقت آپ کا اصل پاسپورٹ اور شناختی کارڈ پڑا ہے۔میں طواف ٹریول اینڈ ٹورز کے آفس سے اعزاز سید بول رہا ہوں۔''میں نے جلدی سے پوچھا:''اچھا یہ بتائیے کہ میری بیگم کا پاسپورٹ اور شناختی کارڈ بھی آپ کے سامنے ہے یا نہیں؟'' بولے:''وہ بھی ہے۔''میں نے اطمینان کا سانس لیا اور پوچھا:''آپ نے میرا فون نمبر

کہاں سے لیا؟'' کہنے لگے: ''ابھی کچھ دیر پہلے منشا قاضی صاحب میرے پاس بیٹھے تھے، ان سے لیا ہے۔آپ کو شاید یاد نہ ہو لیکن مجھے یاد ہے کہ 1995ء میں مال روڈ پر دیال سنگھ مینشن میں واقع شیزان ہوٹل میں آپ کے پہلے شعری مجموعے ''منظر بدل گئے'' کی تعارفی تقریب میں آپ سے میری ملاقات ہوئی تھی۔''ان کے یاد دلانے پر بھی جب مجھے یاد نہ آیا تو انھوں نے مجھے چائے کی دعوت دے ڈالی۔انھوں نے بتایا کہ طواف ٹریول اینڈ ٹورز کا دفتر شملہ پہاڑی چوک میں واقع ہے۔میں نے انھیں بتایا کہ میں ان دنوں گورنمنٹ دیال سنگھ کالج لاہور میں اردو کا اسسٹنٹ پروفیسر ہوں۔مجھے عمرے پر روانہ ہونے کے لیے محکمے سے این او سی لینا ہوگا اور یہ این او سی آسانی سے نہیں ملتا اس کے لیے بہت کشٹ کاٹنا پڑتا ہے۔براہ کرم مجھے روانگی کی تاریخ بتا دیجیے تا کہ میں این او سی کے لیے درخواست ابھی سے دے دوں۔میری بات سن کر انھوں نے فون بند کر دیا۔تقریباً پندرہ منٹ کے بعد دوبارہ فون کیا۔بولے: ''آپ 17 اپریل 2015ء کو شام پانچ بجے سعودی ایئر لائنز کی پرواز کے ذریعے لاہور سے روانہ ہوں گے اور 2 مئی کو اسی ایئر لائنز سے لاہور واپس پہنچیں گے۔''

اعزاز سید صاحب نے تو کمال کر دیا تھا، میں نے لوگوں سے سنا تھا کہ ٹریول ایجنسیوں کے لوگ روانگی کی تاریخ اور وقت ایک آدھ دن پہلے بتاتے ہیں مجھے انھوں نے ایک مہینہ پہلے ہی روانگی کی تاریخ اور وقت بتا کر حیران کر دیا تھا۔حسیب پاشا صاحب نے مجھے مبارک باد دی اور بولے: ''یار اعزاز سید صاحب سے مجھے بھی ملوائیں۔میں بھی عمرے پر جانا چاہتا ہوں۔

سفرِ عشق کا آغاز ہوا چاہتا ہے

اجازت نامہ

سرکاری ملازمین بے چارے اللہ میاں کی گائے ہوتے ہیں۔جس کھونٹے سے سرکار انھیں باندھ دیتی ہے، برسوں وہیں بندھے رہتے ہیں۔سارے اصول ضابطے سب سے پہلے انھی پر لاگو ہوتے ہیں۔میرے پاسپورٹ پر چونکہ گورنمنٹ سروس کا ٹھپا لگا ہوا ہے اس لیے میرے لیے لازم تھا کہ عمرے پر روانہ ہونے کے لیے اپنے محکمے سے چھٹی اور ایک سرٹیفکیٹ لوں جس پر صاف لفظوں میں لکھا ہو کہ محکمے کو میری حجازِ مقدس روانگی پر کوئی اعتراض نہیں۔سرکاری زبان میں اسے ایکس پاکستان لیو اور این او سی کہا جاتا ہے۔ایک اور مثال

میرے ذہن میں آئی ہے کہ سرکاری ملازم اس بہو کی طرح ہوتا ہے جس کی کم از کم چار ساسیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ مجھے اس سفر پر روانہ ہونے کے لیے پرنسپل، ڈائریکٹر کالجز، ڈی پی آئی کالجز اور سیکرٹری ہائر ایجوکیشن سے اجازت لینا پڑی۔ بطور مسلمان ہم سب کا عقیدہ ہے کہ جب تک شاہِ دو جہاں حضرت محمدؐ کی طرف سے منظوری نہ ہو اس وقت تک ہم اُن کے شہر میں داخل نہیں ہو سکتے لیکن یہاں عجیب واقعہ ہے کہ شاہِ دو جہاں حضرت محمد ﷺ کی طرف سے میری منظوری ہو چکی تھی لیکن اس کے باوجود انھیؐ کے چاہنے اور ماننے والوں نے اپنا اپنا اجازت نامہ حاصل کرنے کی پابندی بھی لگا رکھی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک عمرے اور حج پر جانے والے سرکاری ملازمین کو خفیہ پولیس کی سپیشل برانچ سے عمدہ چال چلن کا سرٹیفکیٹ لینا پڑتا تھا لیکن اب چونکہ پولیس کا اپنا کردار مشکوک ہوتا جا رہا ہے اس لیے پنجاب حکومت نے اس سے یہ اختیار واپس لے لیا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا ہے کہ عمرے اور حج پر جانے والے سرکاری ملازموں کی چھٹی کی درخواست جلد منظور ہو جاتی ہے۔ سو میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ میری روانگی 17 اپریل 2015ء کو تھی اور 2 مئی 2015ء کو پورے پندرہ دن کے بعد میری واپسی ہونا تھی لیکن میں نے اپنے ایک تجربہ کار دوست کے مشورے پر محکمے سے 21 دن کی چھٹی منظور کرائی تھی۔ ہوائی کمپنیوں کے بارے میں تو آپ جانتے ہی ہیں کہ جہاز دو دو دن کی تاخیر کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بیرون ملک خدانخواستہ کوئی حادثہ بھی پیش آ سکتا ہے جس کے باعث وہاں آپ کو اپنا قیام ایک آدھ دن بڑھانا پڑ سکتا ہے اس لیے میں جب بھی بیرونِ ملک جاتا ہوں کم از کم ایک ہفتہ زیادہ چھٹی لیتا ہوں۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ ایکس پاکستان لیو میں توسیع نہیں ہو سکتی۔ چھٹی ختم ہونے کے اگلے ہی روز آپ کو دوبارہ دفتر جائن کرنا ہوتا ہے دوسرا سبب یہ ہے کہ بیرونِ ملک سے آنے کے بعد آپ کو اپنے رشتے داروں اور دوستوں سے ملنا ہوتا ہے یا آرام کرنا ہوتا ہے اس کے لیے چند چھٹیاں

ضروری ہوتی ہیں۔

والدین سے الوداعی ملاقات

جب چھٹی منظور ہو گئی تو مجھے یقین ہو گیا کہ اب دنیاوی ناخدا مجھے اس شاندار سفر پر روانہ ہونے سے نہیں روک سکتے۔ میرے پڑھنے والوں کے لیے یہ بات شاید نئی ہو کہ لاہور میں میرا کوئی رشتے دار نہیں۔ یہاں میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا ہوں۔ البتہ دوست بہت سے ہیں۔ کچھ سے میرا دل ملا ہوا ہے اور کچھ سے ہاتھ ملائی والی دوستی ہے۔ میرے چاروں بچوں اجالا، احسن، جواد اور ارفع کو ان کے واحد چاچو پہلے ہی ملتان لے جا چکے تھے جہاں ان کے دادا، دادی بے تابی سے ان کے منتظر تھے۔ میرے چاروں بچے، مجھ سے زیادہ اپنے چاچو اور دادا، دادی کے ساتھ خوش رہتے ہیں، اس لیے مجھے فکر نہ تھی کہ ہمارے بغیر بچے کس طرح رہیں گے؟ چونکہ روانگی کا دن قریب آ رہا تھا ہم دونوں میاں بیوی نے سوچ رکھا تھا کہ عمرے پر روانہ ہونے سے پہلے اپنے والدین کے پاس جائیں گے، ان کی دعائیں لیں گے اور عازمِ سفر ہو جائیں گے۔ چنانچہ ہم دونوں اچھی شہرت رکھنے والی ایک ٹرین کے ٹھنڈے کمرے میں سوار ہو گئے اور ملتان جا پہنچے۔ بچوں کی نانی اماں بھی ملتان ہی میں ہوتی ہیں اس لیے شبنم کچھ زیادہ ہی خوش تھی۔ میرے والد اور والدہ نے ہمارا یوں استقبال کیا جیسے ہم عمرہ کر کے آئے ہیں۔ وہ دونوں ہم سے زیادہ خوش تھے کہ اُن کا بیٹا اور بہو خانۂ خدا اور روضۂ رسولؐ پر حاضری دینے جا رہے ہیں۔ جس روز ہمیں لاہور آنا تھا اس روز میرے والد صاحب نے ایک رسالہ میرے سامنے رکھ دیا جس میں کسی صاحب کی سفرِ حجاز کی یادیں چھپی ہوئی تھی انھوں نے لکھا تھا کہ مدینے میں کھجور مارکیٹ کے قریب واقع

ایک دکان سے انھوں نے روغنِ بلسان خریدا، جوڑوں کے درد کے لیے یہ نہایت مفید ہے۔والد صاحب نے مجھ سے روغنِ بلسان لانے کی فرمائش کی۔میرے لیے یہ حکم تھا۔ میں نے یہ حکم دل پر لکھ لیا کہ کہیں مدینے جا کر عقیدت کی رَو میں بہ کر بھول ہی نہ جاؤں۔ ابھی ملتان میں ہمارا دوسرا ہی دن تھا کہ لاہور سے طواف ٹریول اینڈ ٹورز کے اعزاز سید صاحب کا فون آ گیا۔کہنے لگے: ''آپ دونوں کے ویزے لگ کر آ گئے ہیں۔پرسوں آپ کی روانگی ہے۔آ کر پاسپورٹ لے جائیں''ہم ایک بار پھر لاہور گئے۔رات کو سنت نگر میں واقع اپنے گھر پہنچے تو گھر کے در و دیوار عجیب سے لگنے لگے۔بچوں کا شور جس سے کان مانوس تھے،آج نہیں تھا۔

لگتا ہے زندگی سے الگ ہو گیا ہوں میں
بچے تو کھیلتے ہیں مگر سو گیا ہوں میں

الحباش!الحباش!

یہ رات خدا خدا کر کے کاٹی۔صبح ہوئی تو معمولات سے فارغ ہونے کے بعد اعزاز سید صاحب سے فون پر رابطہ کیا۔وہ دفتر ہی میں تھے۔ان کے پاس پہنچا تو

سینۂ شمشیر سے باہر تھا دمِ شمشیر کا

والی کیفیت تھی۔شاہ صاحب میری دلی کیفیت کو بھانپ چکے تھے۔سو انھوں نے جاتے ہی دونوں پاسپورٹ میرے حوالے کیے۔کچھ ضروری معلومات دیں۔بولے ''سعودی عرب میں کہیں پڑی ہوئی چیز بھولے سے بھی مت اٹھائیے گا ورنہ اپنے ہاتھ کٹوا بیٹھیں گے''انھوں نے پاسپورٹوں کی حفاظت کا مشورہ بھی دیا۔مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ کے جن ہوٹلوں میں ہمارے قیام کا انھوں نے بندوبست کیا تھا ان کے واؤچر میرے حوالے

کیے۔یہ ایک ہی واؤچر کی کئی کاپیاں تھیں۔یہ کاپیاں وہاں جا کر بہت کام آئیں۔اگر میرے پاس یہ کاپیاں نہ ہوتیں تو شائد ہمیں مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ کی سڑکوں پر سونا پڑتا حتیٰ کہ مقدس مقامات کی زیارتوں کے لیے بھی واؤچر کی کاپیاں ضروری تھیں۔انھوں نے بتایا کہ جب آپ جدہ ایئرپورٹ پر امیگریشن اور کسٹم کی کارروائیوں سے فارغ ہوں گے تو ایک صاحب آپ کو ملیں گے جو پاگلوں کی طرح ''الحباش!الحباش!'' کی صدائیں لگا رہا ہوگا۔وہی آپ کا میزبان ہوگا۔وہی آپ کو بس کے ذریعے مکے میں آپ کے ہوٹل تک پہنچائے گا۔الحباش دراصل سعودی کمپنی ہے جو طواف ٹریول اینڈ ٹورز کے ساتھ مل کر کام کرتی ہے۔

مشورے ہی مشورے

سعودی عرب میں چھوٹی موٹی ضرورتوں اور خریداری کے لیے سعودی ریال آپ کے پاس ہونا بہت ضروری ہیں۔اس لیے میں اپنی جیب میں تقریباً ایک لاکھ روپے لے کر گیا تھا۔شاہ صاحب نے مشورہ دیا کہ لاہور کے کسی رجسٹرڈ منی ایکسچینجر سے ریال خرید لیجئے گا۔اور یاد رہے اس سے رسید بھی ضرور حاصل کر لیجیے گا۔کسی راہ چلتے شخص سے ریال لینے کی غلطی نہ کیجیے گا۔جعلی ریال،سعودی عرب لے گئے تو قانون کے شکنجے میں آ جائیں گے۔چنانچہ میں ریگل چوک گیا اور وہاں سے ایک مشہور منی ایکسچینجر سے پاکستانی روپوں کے بدلے میں ریال لے لیے۔تقریباً پندرہ سو ریال میں نے حاصل کیے تھے۔اس کے باوجود کچھ پاکستانی رقم بچ گئی تھی جو میں نے جیب میں رکھ لی۔مجھے شاہ صاحب نے بتایا تھا کہ سعودی عرب میں بھی پاکستانی کرنسی کے بدلے ریال مل جاتے ہیں انھوں نے یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ جدہ ایئرپورٹ پر اترتے ہی سب سے پہلے موبائل فون کی سم خرید لیجیے گا۔میں

نے اپنی موبائل کمپنی یوفون سے پتا کیا تو بتایا گیا کہ اب ہر پاکستانی سم سعودی عرب میں بھی چلتی ہے۔نقصان اس کا یہ ہے کہ ہر ان کمنگ کال پر فی سیکنڈ 38 پیسے کاٹے جاتے ہیں۔ فائدہ یہ ہے کہ پاکستان میں موجود دوستوں کے پاس چونکہ پہلے سے یہ نمبر موجود ہو گا اس لیے ان کا آپ سے رابطہ رہے گا۔سعودی عرب میں اپنی پاکستانی سم چلانے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں کم از کم پانچ ہزار روپے کا بیلنس موجود ہو۔سو میں نے اپنے فون میں پانچ ہزار روپے کا بیلنس لوڈ کرا لیا۔میرے ایک دوست نے ایک عدد احرام،ایک بیلٹ اور ایک عبایا پہلے سے بھیج دی تھی۔ایک اور دوست بھی اسی شام ایک احرام اور بیلٹ لے کر میرے پاس پہنچ گئے۔مجھ پر اللہ کا خاص کرم ہے کہ میرے دوست آپ ہی آپ حقِ دوستی ادا کرتے ہیں اور مجھے ممنونِ احسان رکھتے ہیں۔

سفرِ عشق کا آغاز

اگلے روز 17 اپریل تھی۔روانگی کا دن آن پہنچا تھا۔صبح سویرے ابھی بیڈ ٹی بھی نہیں پی تھی کہ بیل بجی گلی میں جھانک کر دیکھا تو شکیلہ اپنے دو بچوں سلمان اور ریحان کے ساتھ کھڑی تھی۔شکیلہ،شبنم کی دوست ہے۔ہمارے لیے ناشتے کا سامان لائی تھیں۔اس کے بعد یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا۔گلی کی کئی بیبیاں آئیں۔کچھ پھول لائیں اور کچھ کھانے پینے کا سامان۔میرا شاگردِ خاص رمیز چشتی اپنے سیاسی مرشد چودھری لیاقت کے ساتھ آیا۔رمیز کے ہاتھ میں پھول تھے اور چودھری لیاقت گولڈ لیف کے چند پیکٹ تھامے ہوئے کھڑے تھے۔تقریباً دس بجے نیشنل بک فاؤنڈیشن کی گاڑی ہمیں ایئرپورٹ لے جانے کے لیے پہنچ گئی۔این بی ایف لاہور کی ڈائریکٹر محترمہ نزہت اکبر کی مہربانی سے ممکن ہوا تھا کہ اویس صاحب گاڑی لے کر بروقت پہنچ گئے۔اویس صاحب نے سارا سامان گاڑی میں رکھا۔

ہمیں بٹھایا اور ایئرپورٹ کی طرف چل پڑے۔میں دل ہی دل میں گنگنا رہا تھا۔

سفرِ عشق کا آغاز ہوا چاہتا ہے

عمرے پہ جا رہے ہو تو احرام باندھ لو

واقعی جا رہے ہیں

ایئرپورٹ پہنچے تو وہاں بادامی باغ کے لاری اڈے سے بھی زیادہ ہجوم تھا۔مجھے ٹریول ایجنسی کے شاہ صاحب نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ان دنوں عمرے پر جانے والوں کا رش ہے، اس لیے ایئرپورٹ پر بارہ بجے تک پہنچنا ضروری ہے۔عام طور پر انٹرنیشنل فلائٹ کے مسافروں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ تین گھنٹے پہلے ایئرپورٹ پہنچ جائیں۔ہم اپنے جہاز کی روانگی سے تقریباً پانچ گھنٹے پہلے ہی پہنچ گئے تھے۔شبنم کو ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ عمرے پر جا رہی ہے۔وہ سمجھ رہی تھی کہ ابھی ہم ایئرپورٹ کے اندر داخل ہونے لگیں گے اور وہاں کھڑے سیکیورٹی فورس کے لوگ ہمارے کاغذات دیکھ کر کہیں گے کہ آپ کے

سارے کاغذات جعلی ہیں اور ہمیں گرفتار کر لیں گے میرا چھوٹا بھائی عامر ہمیں الوداع کہنے کے لیے خاص طور پر فیصل آباد سے آیا تھا۔فیصل آباد ہی میں میرا ایک اور چھوٹا بھائی طاہر رہتا ہے۔وہ بھی اپنی فیملی سمیت ہمیں رخصت کرنے کا آرزومند تھا لیکن میں نے اُسے منع کر دیا تھا۔نیشنل بک فاؤنڈیشن کے اویس صاحب نے گاڑی سے ہمارا سارا سامان نکالا، ایک ٹرالی میں رکھا اور انٹرنیشنل ٹرمینل کے اندر جانے کو کہا۔ ٹرالی گھسیٹتے ہوئے داخلی دروازے پر پہنچا تو وہاں موجود سیکیورٹی اہلکار نے پاسپورٹ اور ٹکٹ طلب کیے۔میرا خیال تھا کہ وہ ہمیں اندر جانے دے گا لیکن اس نے ہمیں وہیں کھڑے رہنے کو کہا۔شبنم کا خدشہ کچھ کچھ ٹھیک لگنے لگا تھا۔ میں بھی اب سوچ رہا تھا کہ کاغذوں میں شاید کوئی گڑ بڑ ہے۔ لیکن جب اس سیکیورٹی اہل کار سے دریافت کیا تو بولا: ''آپ کی فلائٹ شام پانچ بجے روانہ ہوگی آپ ایئر پورٹ کے اندر دو بجے داخل ہو سکیں گے۔'' دو بجنے میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔اویس صاحب چونکہ ایئر پورٹ کے ڈومیسٹک ٹرمینل میں نیشنل بک فاؤنڈیشن کے شوروم کے انچارج ہیں اس لیے انھوں نے فوری طور پر وہاں موجود کسی افسر سے بات چیت کی۔جان پہچان کام آ گئی۔انھوں نے ہمیں وقت سے پہلے ہی انٹرنیشنل ٹرمینل کے اندر داخلے کی اجازت دلا دی۔نہ صرف اجازت دلائی بلکہ ہمیں اندر بھی بھیجا۔ٹرمینل کے اندر داخل ہوتے ہی یوں لگا جیسے ہم جنت میں داخل ہو گئے ہیں۔اندر یخ بستہ ماحول تھا۔ میں سوچنے لگا کہ میرا چھوٹا بھائی عامر اور اویس دونوں گرمی میں کھڑے ہوں گے۔ٹرمینل کے اندر داخل ہونے کے بعد مجھے اور شبنم کو کچھ کچھ یقین ہونے لگا تھا کہ ہم واقعی عمرے پر جا رہے ہیں۔

جیل یا تختہ دار

سعودی ایئر لائنز والوں نے ابھی بورڈنگ کارڈ دینا شروع نہیں کیے تھے۔اس لیے ہم سامان ایک طرف رکھ کر باری باری ٹرمینل میں گھومتے رہے۔سامان کی حفاظت کبھی میں کرتا کبھی شبنم۔یہاں کی دنیا ہی اور تھی۔ہم تو ہمیشہ ریلوے اسٹیشنوں اور لاری اڈوں کے دھکے کھاتے رہے ہیں جہاں ہمارے جیسے ہی لوگ ہمیں دکھائی دیتے تھے لیکن یہاں ایسے چہرے دکھائی دے رہے تھے جنہیں قدرت نے شاید بطور خاص بنایا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد سعودی ایئر لائنز کے کاؤنٹروں پر چہل پہل ہونے لگی۔بورڈنگ کارڈ جاری کرنے کے لیے وہاں زنانہ عملہ آ چکا تھا۔ہم نے جلدی سے اپنا سامان اٹھایا اور ایک کاؤنٹر پر پہنچے۔مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ سعودی ایئر لائنز نے کتنا سامان ساتھ لے جانے کی اجازت دے رکھی ہے۔ہمارے پاس دو بڑے بیگ تھے اور دو چھوٹے۔میں نے کسی بیگ کو تالا نہیں لگایا تھا سب کچھ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیا تھا۔یونہی میرے دل میں خیال آیا کہ اگر میرے بیگ میں ایئر پورٹ یا ایئر لائنز کے کسی ملازم نے کوئی ایسی ویسی چیز رکھ دی تو سعودی عرب جا کر سیدھا جیل جاؤں گا یا تختہ دار پر لٹکایا جاؤں گا۔میرے دل میں ابھی یہ خیال آیا ہی تھا کہ بورڈنگ کاؤنٹر کے سامنے مجھے ایک اور کاؤنٹر دکھائی دیا جہاں ایک صاحب بڑی سی مشین سے بڑے بڑے بیگز کی لیمی نیشن کر رہے تھے۔ میں فوراً اپنے وہ بیگ جو مجھے بک کروانا تھا اس کاؤنٹر کی طرف لے گیا اور ان پر لیمی نیشن کرا لی۔لیمی نیشن دیکھ کر شبنم بولی: ''چار پیسے لگ گئے ہیں لیکن چیز ستھری بن گئی ہے۔'' مجھے یاد آ گیا کہ یہ فقرہ پی ٹی وی کے ایک ڈرامے میں ایک مزاحیہ اداکار نے کسی کی ٹنڈ دیکھ کر کہا تھا۔بورڈنگ کارڈ حاصل کرنے کے بعد اگلا مرحلہ امیگریشن کا تھا۔یہاں ایف آئی اے کا عملہ پاسپورٹ اور ویزے کا معائنہ کرتا ہے اور ایگزٹ (Exit) کی مہر لگا کر واپس کر دیتا ہے۔ میرا پاسپورٹ دیکھ کر کاؤنٹر پر بیٹھے شخص نے مجھ سے محکمے کا این او سی مانگا جو پہلے سے میں نے

اپنے ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ وہ اس نے اپنے پاس رکھ لیا اور پاسپورٹ ہمیں واپس کر دیے۔ اب ہم سامان لے کر ٹرمینل کے اس حصے میں داخل ہو گئے جہاں سے ہمیں جہاز میں سوار ہونا تھا۔ اس حصے میں داخل ہونے سے پہلے ہماری ایک بار پھر تلاشی لی گئی۔ مجھے اور شبنم کو مشین سے گزارا گیا۔ میں نے لنڈا بازار سے خریدے نہایت موٹے تلے والے جوتے پہن رکھے تھے۔ وہاں موجود اہل کار نے مجھے بوٹ اور پتلون کی بیلٹ اُتار کر سکیننگ مشین میں رکھنے کو کہا یہ سنتے ہی دل زور زور سے دھڑکنے لگا کیونکہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ بوٹ کے موٹے تلے میں کیا چھپا ہوا ہے؟ میں جی ہی جی میں یہ مرحلہ بخت بھی بخیر و خوبی طے ہو جانے کی دعا مانگ رہا تھا۔ جب اس اہل کار کی تسلی ہو گئی تو اس نے ہمیں اندر جانے کی اجازت دے دی۔

دیہاتیوں کا کھانا

اب ہم دونوں ایک ایسی جگہ پہنچ گئے تھے جہاں سے ایئر پورٹ پر کھڑے ہوئے جہاز ہمیں صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ہم دونوں دیہاتیوں کی طرح وہاں پڑے ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ بھوک بھی لگ رہی تھی اور چائے کی طلب بھی ہو رہی تھی۔ چنانچہ ہم نے شکیلہ کا لایا ہوا بچا کھچا ناشتا نکالا اور اسے لنچ سمجھ کر کھانے لگے۔ ٹرمینل کے اندر بیٹھ کر یہ کھانا کھاتے ہوئے میں خود کو بادشاہ محسوس کر رہا تھا۔ وردی میں ملبوس ایک بیرا قریب سے گزرا تو میں نے اسے ایک کپ چائے اور ایک ہاف لٹر کی سافٹ ڈرنک بوتل لانے کا آرڈر دیا۔ اس آرڈر میں درخواست کا لہجہ تھا۔ میرا لہجہ آپ ہی آپ بدل گیا تھا۔ میں نے بیرے سے ریٹ بھی نہیں پوچھا۔ شبنم نے کہا بھی کہ پہلے ریٹ پوچھ لیں۔ میں نے کہا ”نہیں ہم کون سا یہاں روز آئیں گے۔ لوٹ لینے دو آج اسے“ بیرا چائے لایا تو وہ نہایت خوش ذائقہ لگی۔ یہ

سب اچھے موڈ کا کرشمہ تھا۔ ہر چیز اچھی لگ رہی تھی۔ ہمارے بعد وہاں بے شمار لوگ آ گئے جو عمرے پر جا رہے تھے۔ ہمارے ساتھ والے تین چار بنچوں پر پندرہ بیس دیہاتی آ بیٹھے ان میں آدھے مرد تھے اور آدھی عورتیں۔ سب نے وہاں بیٹھتے ہی اپنی اپنی پوٹلی کھولی۔ ان کے پاس پراٹھے تھے۔ انھوں نے با جماعت پراٹھے کھائے۔ اچار اور پراٹھے کی خوشبو سارے ٹرمینل میں پھیلی ہوئی تھی۔

احرام باندھ لیجیے!

چند لمحوں کے بعد مائیک پر اعلان کیا گیا کہ عمرے پر جانے والے لوگ احرام باندھ لیں۔ یہ اعلان سنتے ہی وہاں موجود عمرہ زائرین نے اپنے اپنے تھیلے اٹھائے اور سامنے موجود ایک کمرے میں گھس گئے۔ جہاں وضو اور نماز کے لیے صاف ستھری جگہ میسر تھی۔ اس کے ساتھ ہی خواتین کے لیے ایک جگہ بنائی گئی تھی۔ خواتین اُدھر جا رہی تھیں۔ وہاں موجود لوگوں میں سے پہلے مرد احرام باندھنے کے لیے گئے۔ جب وہ احرام باندھنے اور نفل ادا کرنے کے بعد آ گئے تو خواتین اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ ہمارے پاس چونکہ کچھ سامان تھا اس لیے پہلے میں احرام باندھنے کے لیے چلا گیا اور واپس آیا تو شبنم خواتین کے لیے مخصوص کمرے میں اپنا وہ لباس لے کر چلی گئی جسے پہن کر اسے عمرہ ادا کرنا تھا۔ جب وہ اس کمرے سے واپس آئی تو اس نے سر پر اسکارف باندھا ہوا تھا۔ بال، گردن اور گلا ڈھانپ رکھا تھا۔ صرف چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ ہمارے اس پہلے مقدس سفر میں ہمارا کوئی معلم نہ تھا۔ میرے دوستوں نے مجھے عمرے سے متعلق کچھ کتابیں عنایت کی تھیں جن سے مجھے ساری معلومات مل گئی تھیں۔ شبنم نے یہ کتابیں مجھ سے پہلے پڑھ لی تھیں اس لیے وہ ہر کام ٹھیک ٹھیک کر رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ایک اور ہی مخلوق پیدا ہو گئی تھی۔ احرام

باندھے ہوئے عمرہ زائرین پر کفن پوش مُردوں کا گمان ہو رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ احرام کفن ہی کی ایک شکل ہے۔ اللہ کے حضور پیش ہونے کا یہی اسلامی طریقہ ہے جو ہمیں ہمارے مذہب نے بتایا ہے۔ میرے ٹیلی فونک دوست خالد محمود صاحب نے ڈاکٹر ریاض الرحمٰن کا مرتب کیا ہوا ایک معلوماتی کتابچہ بھیجا تھا اس میں احرام کے بارے میں درج معلومات میں یہاں درج کر رہا ہوں:

”جس دن آپ کی روانگی ہو، اس دن سب سے پہلے اپنے جسم کے تمام غیر ضروری بال صاف کریں۔ ہاتھ پاؤں کے ناخن تراشیں۔ پھر غسل یا وضو کر کے ہوائی جہاز میں سوار ہونے سے قبل حالتِ احرام میں آ جائیں۔ مرد کا احرام صرف دو اَن سلی چادریں ہیں جن کے نیچے کوئی بنیان، انڈر ویئر، جراب یا پاجامہ نہیں ہوگا۔ مرد اپنے دونوں کندھے اور بازو ڈھانپ کر رکھیں۔ مرد حالتِ احرام میں پاؤں میں ہوائی چپل یا ایسا جوتا پہن لیں جس سے پاؤں کی درمیانی ابھری ہوئی ہڈی ننگی رہے۔

خواتین کا احرام موسم کے لحاظ سے ان کا روزمرہ لباس ہے۔ سر کے بال ڈھانپنے کے لیے ایک رومال یا اسکارف اس طرح باندھیں کہ سر کے بال نظر نہ آئیں۔ یا عبایا پہن لیں۔ یہ رومال، اسکارف یا عبایا احرام نہیں ہیں۔ خواتین حالتِ احرام میں اپنے چہرے اور پیشانی کو کھلا رکھیں۔ خواتین کے لیے جوتے کی کوئی پابندی نہیں...... مرد اور خواتین احرام کی حالت میں آنے کے بعد دو نفل احرام کی نیت سے ادا کریں۔ خواتین ایام کی حالت میں نفل ادا نہیں کریں گی بلکہ دل میں ارادہ اور زبان سے نیت کریں گی اور سارے افعال ادا کریں گی لیکن حرم میں داخل نہ ہوں گی۔ مرد نفل پڑھنے سے پہلے اپنا سر چادر کے پلو یا ٹوپی سے ڈھانپ لیں۔ سلام پھیرنے کے بعد مرد اپنا سر ننگا کر لیں۔ اب عمرہ مکمل ہونے تک ہر وقت سر ننگا رکھا جائے گا اور تمام نمازیں ننگے سر ادا ہوں گی۔ خواتین ایسا نہیں کریں گی۔ پھر مصلے

پر قبلہ رو بیٹھے بیٹھے عمرے کی نیت کریں۔“

پہلا سلام ارضِ مقدس کی خاک کو

فرمائشی پروگرام

احرام باندھنے کے بعد ہم دونوں جہاز کی روانگی کا انتظار کرنے لگے۔ اسی اثنا میں میرے موبائل فون کی بیل بجی، کال او کے کی تو دوسری طرف شبنم کا بھائی اشرف تھا۔ منیر نیازی کی طرح وہ بھی ہمیشہ ہر کام میں دیر کر دیتا ہے۔ وہ ہمیں الوداع کہنے آیا تھا مگر اب ہم وہاں پہنچ چکے تھے جہاں سے ہمارا باہر جانا ممکن نہ تھا۔ مگر اس کا اصرار تھا کہ میں باہر آؤں اور اس سے کچھ سامان وصول کر لوں جس میں کھانے پینے کا بھی کچھ سامان تھا۔ میں نے اسے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی لیکن میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ مُصر تھا کہ میں باہر آ کر اس سے سامان وصول کروں، جب میں نے اسے کہا کہ اگر تم اندر آ سکتے ہو تو آ جاؤ تو

اس نے فون بند کر دیا۔تقریباً پندرہ منٹ کے بعد ایک اور نمبر سے فون آیا۔آواز آئی:اگر آپ ناصر بشیر صاحب ہیں تو مجھے مل لیں میں ٹرمینل کے اندر لگے ٹیلی ویژن کے نیچے کھڑا ہوں آپ کے ایک عزیز اشرف صاحب نے آپ کا کچھ سامان دیا ہے۔"تھوڑی سی جستجو کے بعد وہ صاحب مجھے مل گئے۔انھوں نے مجھے ایک تھیلا دیا جس میں پھولوں کے دو ہار اور ایک چپل تھی۔ان صاحب نے مجھے دو سو ریال بھی دیے کہ اشرف صاحب نے دیے ہیں۔ سامان کی رسید دینے کے لیے میں نے اشرف کو فون ملایا تو اس نے کہا کہ دو سو ریال اپنے پاس رکھ لیں۔آپ کو مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ میں جو چیز پسند آئے میرے لیے خرید لیجیے گا۔ ہار آپ کے گلے میں ڈالنے کے لیے لایا تھا،چپل کے بارے میں کہنے لگا کہ اسے پہن کر آپ حرمین شریفین جایئے گا اور کسی نہ کسی طرح اسے واپس لے آیئے گا۔اس کی پوری بات سن کر میں نے فون بند کر دیا۔شبنم نے اپنے بھائی کے لائے ہوئے ہاروں میں سے ایک میرے گلے میں ڈال دیا اور دوسرا میں نے اس کے گلے میں ڈال دیا۔چپل اس نے اپنے دستی سامان میں سنبھال کر رکھ لی۔یہاں بتاتا چلوں کہ عمران نقوی پہلی بار عمرے پر گیا تو میں بابا کی دو چپلیں خرید کر اس کے گھر جا کر اسے دے کر آیا تھا۔ایک چپل اس کے لیے تھی اور دوسری کے لیے میں نے اس سے وہی درخواست کی تھی جواب اشرف مجھ سے کر رہا تھا۔ہاں یاد آیا اشرف نے یہ درخواست بھی کی تھی کہ اس کی طرف سے حرم شریف کے قریب واقع کبوتر چوک میں کچھ دانہ بھی ڈال دیجیے گا۔

احرام کی پابندیاں اور اجازتیں

اشرف کے بار بار فون آنے پر مجھے غصہ تو آیا لیکن احرام کی پابندیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اسے باندھنے کے بعد لڑائی جھگڑا اور غصہ نہیں کرنا۔میں نے ڈاکٹر ریاض الرحمٰن

مرحوم کی کتاب نکالی اور اس کے صفحہ نمبر دس پر درج باب "احرام کی پابندیاں" کا مطالعہ شروع کر دیا اس عنوان کے تحت وہاں یہ درج تھا:

"خشکی کے جانور کا شکار کرنا یا شکار کی طرف اشارہ کرنا یا شکاری کی مدد کرنا،مرد کو ایسا جوتا پہننا جس سے پاؤں کی درمیانی ابھری ہوئی ہڈی ڈھک جائے،جسم کے کسی حصے سے بال صاف کرنا،اکھاڑنا یا شیو کرنا،حدودِ حرم میں لگے درختوں سے پتے یا ٹہنی توڑنا،کسی بھی طریقے سے خوشبو استعمال کرنا،خوشبو لگی جگہوں کو ہاتھ لگانا،ٹوتھ پیسٹ کرنا،جوں کا مارنا،ناخن تراشنا،جسم سے میل کچیل اتارنا،مرد کا سر اور منہ ڈھانپنا،خواتین کا چہرے کو ڈھانپنا مرد کو سلا ہوا کپڑا پہننا،خواتین کا سر کو کھولنا(وضو کرتے ہوئے مسح کے وقت سر ننگا کر سکتی ہیں)خواتین کا اونچی آواز میں تلبیہ پکارنا،لڑائی جھگڑا کرنا،کسی کو قتل کرنا،بوسہ لینا،شہوت والی باتیں کرنا،فحش کلامی کرنا،ازدواجی تعلقات قائم کرنا۔"اسی باب میں یہ بھی درج تھا کہ احرام کی حالت میں درج ذیل کاموں کی اجازت ہے:

"غسل اور مسواک کرنا،سائے کے نیچے بیٹھنا،سر کے اوپر چھتری لینا،سر کھجانا جس سے بال نہ ٹوٹیں،انجکشن لگوانا،آنکھ کان میں دوا ڈالنا،درد کرنے والا دانت نکلوانا،سرمہ لگانا،کھانا پکانا،انگوٹھی پہننا،کلائی گھڑی باندھنے،عینک یا دھوپ کا چشمہ لگانا،گلے یا کندھے پر بیگ لٹکانا میلے کپڑے دھونا،پالتو جانور ذبح کرنا،سانپ،بچھو،مکھی مچھر مارنا ٹشو یا رومال سے ناک صاف کرنا(نزلہ زکام کے سبب یا کسی اور وجہ سے)ممنوعاتِ احرام کی خلاف ورزی پر صدقہ،دم اور بدنہ واجب ہو جاتا ہے،صدقے کا مطلب ہے پونے دو کلو جو یا گندم یا اس کے برابر رقم حدودِ حرم میں خیرات کرنا،دم سے مراد ہے پوری بھیڑ،بکری یا گائے یا اونٹ کا ساتواں حصہ لازماً حدودِ حرم میں ذبح کر کے صدقہ کرنا خود یا غنی شخص بالکل نہ کھائے۔حرم کی حدود سے باہر ذبح کرنا یا قیمت صدقہ دے دینا کافی نہیں۔بدنہ کا مطلب

ہے حج یا عمرے کے دوران میں کسی سنگین غلطی پر کفارے کے طور پر پوری گائے یا پورا اونٹ حدودِ حرم میں ذبح کرنا۔

عمرے کے واجب ارکان میں سے کوئی رکن چھوڑنے یا نامکمل کرنے پر دم واجب ہو جاتا ہے۔مندرجہ ذیل کوتاہیوں یا غلطیوں پر دم واجب ہو جاتا ہے لیکن غلطی ٹھیک کر لینے پر دم ساقط ہو جاتا ہے۔

میقات سے بغیر احرام آگے بڑھنا (یعنی جدے اور مکہ معظمہ میں داخل ہونا ،طوافِ عمرہ بے وضو کرنا،عمرہ کی سعی چھوڑ دینا،حلق یا قصر چھوڑ دینا۔''

یہاں بتاتا چلوں کہ میقات وہ خاص مقام ہوتا ہے جہاں احرام باندھنا ضروری ہو جاتا ہے۔پاکستان سے جانے والوں کو ائیر پورٹ ہی پر احرام باندھنا پڑتا ہے کیونکہ میقات کے مقام پر جہاز محوِ پرواز ہوتا ہے اور اس مقام پر جہاز کے تمام مسافر فوری طور پر احرام نہیں باندھ سکتے۔ہر ملک کے عمرہ زائرین کے لیے میقات الگ الگ ہے۔

ڈبل ڈیکر ہوائی جہاز

یہ باب پڑھ کر کتابچہ ایک طرف رکھا ہی تھا کہ مائیک پر سعودی ائر لائنز کی پرواز کے مسافروں کو مژدۂ جاں فزا دیا گیا کہ ان کی فلائٹ روانگی کے لیے تیار ہے اور بتائے گئے دروازے سے جہاز کے اندر داخل ہو سکتے ہیں۔دوسروں کی طرح ہمیں بھی ارضِ مقدس پر پہنچنے کی جلدی تھی لیکن اس کے باوجود ہم نے پہلے دوسروں کو آگے جانے دیا۔عقل مندی کا تقاضا بھی یہی تھا۔نشستوں کے نمبر مسافروں کو الاٹ ہو چکے تھے اس لیے ہڑبونگ مچنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ہم اپنی باری پر جہاز کے داخلی دروازے پر پہنچے تو پائلٹ اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ ہر مسافر کا بورڈنگ کارڈ خود چیک کر رہا تھا اندر کھڑی ائر ہوسٹس نے

ہمیں ہماری نشستیں دکھائیں۔ہم دونوں خوشی خوشی بیٹھ گئے۔یہ تین نشستیں تھیں کھڑکی والی سیٹ ہماری نہیں تھی۔وہاں ایک صاحب براجمان تھے لیکن ہماری ذرا سی محبت اور محنت سے کھڑکی والی سیٹ ہمیں مل گئی۔جہاز کہاں تھا ایک ڈبل ڈیکر بس تھی جو لاہور سے نارووال جانے والی بس کی طرح کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔زیادہ لوگ عمرہ ادا کرنے جا رہے تھے۔چند ایک تھے جو غالباً بسلسلہ ملازمت یا کاروبار جا رہے تھے کیونکہ یہ بغیر احرام کے تھے۔جہاز نے اڑان بھری تو چند لمحوں کے بعد چینی خدو خال والی ایئر ہوسٹس چائے اور کافی لے کر آ گئی۔اسی نے کھانا بھی دیا۔جہاز میں سوار ننھے بچوں کو ائر لائنز کی انتظامیہ نے قیمتی کھلونے دیے۔میں سوچ رہا تھا کہ ہمارے بچے ساتھ ساتھ ہوتے تو انھیں بھی یہ کھلونے مل جاتے۔لیکن کڑوا سچ ہے کہ اب ائر لائنز والے بچوں کا بھی پورا کرایہ وصول کرتے ہیں۔گویا بچوں کے والدین کو ایک کھلونا تقریباً ستر ہزار روپے میں پڑا۔کئی بزرگ اپنا احرام سنبھالے بار بار ٹائلٹ جاتے نظر آئے۔میں نے سوچا کہ ذرا دیکھوں کہ اتنے بڑے ڈبل ڈیکر ہوائی جہاز کے ٹائلٹ کیسے ہیں؟ دیکھا تو وہ گندگی سے اَٹے ہوئے تھے۔یہ ممکن ہی نہ تھا کہ کوئی مسافر ٹائلٹ گیا ہو اور وہاں اس کا احرام ناپاک نہ ہوا ہو۔خوشبو دار صابن اور خوشبو دار ٹشو بھی وہاں دھرے تھے۔ان کو استعمال کرنے کا مطلب تھا کہ پونے دو کلو جو یا گندم یا اس کے برابر رقم حدودِ حرم میں خیرات کرنا آپ پر لازم ہو گیا ہے۔جہاز کی انتظامیہ نے ہمیں جو کھانا دیا تھا اس میں محبت اور خلوص کی خوشبو شامل تھی یہ خوشبو حالت احرام میں حرام نہیں۔اس لیے یہ کھانا ہم نے خوشی خوشی کھالیا۔

ارضِ مقدس پر پہلا قدم

تقریباً پانچ گھنٹے کی پرواز کے بعد جہاز بخیر و عافیت جدہ ائیر پورٹ پر اُتر گیا۔جدہ

ائیرپورٹ بہت بڑا تھا۔ اتنا بڑا کہ جہاز کئی کلومیٹر ٹیکسی کرتے ہوئے ایک جگہ پر جا کر رکا ۔میرے آئی فون میں خود بخود سعودی عرب کا معیاری وقت سیٹ ہو گیا تھا۔ اس کے مطابق ہم ائیرپورٹ پر تقریباً ساڑھے نو بجے اترے تھے۔ شبنم کے پاس نوکیا فون تھا اس میں پاکستان کے معیاری وقت کے مطابق ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ جہاز سے اترے تو نہایت شاندار بسیں دکھائی دیں جو ہمیں وہاں سے حج ٹرمینل تک لے جانے کے لیے آئی تھیں۔ ٹرمینل یہاں سے خاصا دور تھا۔ چند منٹوں کی مسافت کے بعد تمام عمرہ زائرین کو ٹرمینل کے اندر پہنچا دیا گیا۔ جب تمام عمرہ زائرین اندر داخل ہو چکے تو داخلی اور خارجی دروازے بند کر دیے گئے ۔ہم سب وہاں پڑے بنچوں پر بیٹھ گئے ۔ہم دونوں بھی ایک بنچ پر جم گئے ۔ابھی ہم بیٹھے ہی تھے کہ ایک نوجوان ہاتھ میں موبائل سموں کا پیکٹ لیے میرے پاس آیا۔ میں نے سوچا کہ شبنم کے لیے ایک سم خرید لیتا ہوں۔ لوگوں نے بہت ڈرایا تھا کہ وہاں جا کر عورتیں اکثر گم ہو جاتی ہیں اس لیے ان کے پاس فون کا ہونا بہت ضروری ہے۔ یہ فون میرے شاگرد عزیز عباس کے دوست اشفاق نے مجھے تحفتاً دیا تھا لیکن میں نے دل میں ارادہ کر رکھا تھا کہ پاکستان جا کر اسے بہر حال واپس کر دوں گا۔ سمیں بیچنے والے نوجوان سے میں نے ایک سم خرید لی۔ میرے پاس پانچ پانچ سو ریال کے نوٹ تھے۔ میں نے اسے ان میں سے ایک نوٹ دیا تو اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ پھر جلدی سے بولا: اگر آپ کے پاس ہزار روپے کا پاکستانی نوٹ ہے تو وہ دے دیں۔" میرے پاس چونکہ ہزار کا نوٹ بھی تھا اس لیے میں نے اسے وہی دے دیا۔ میں نے سم خریدی تو وہاں موجود دوسرے لوگ بھی اس سے سمیں خریدنے لگے۔ وہ فی سم 30 ریال لوگوں سے وصول کر رہا تھا۔ سب سے مہنگی سم میں نے خریدی تھی۔ تیس ریال کے تقریباً سوا آٹھ سو پاکستانی روپے بنتے ہیں گویا مجھ سے اس نے زیادہ منافع کمایا تھا۔ یہ سم شبنم کے فون میں ڈالتے ہی ہم نے

پاکستان میں اپنے والدین، بہن بھائیوں اور بچوں کو جدہ پہنچنے کی خبر سنائی۔

مکے کی فضاؤں میں عجب نور سا دیکھا

ارضِ منور

جب موبائل سمیں بیچنے والے لڑکے کی ساری سمیں بک گئیں تو تمام عمرہ زائرین کو ایک بڑے ہال کی طرف دھکیل دیا گیا۔ وہاں امیگریشن اور کسٹم والے بیٹھے تھے۔ پاسپورٹوں پر ٹھپے لگے۔ دستی سامان دیکھا گیا۔ یہاں قیامت کا سماں تھا نہ شور شرابا، سب لوگ بہت آسانی سے اس مرحلے سے گزر گئے۔ بیک وقت کام نمٹانے کے لیے کئی کاؤنٹر بنائے گئے تھے اور ہر کاؤنٹر پر عرب نوجوان عربی لباس پہنے کھڑے تھے۔ وہ نہایت چستی سے ہر آدمی سے اس کا پاسپورٹ لیتے، کمپیوٹر میں کچھ دیکھتے اور ٹھپا لگا کر واپس کر دیتے۔ ہر کاؤنٹر پر ایک خودکار کیمرا لگا ہوا تھا۔ وہ عرب نوجوان جس شخص کا پاسپورٹ دیکھنے کے

لیے لیتا، غیر محسوس طریقے سے اس کی تصویر بھی اُتار لیتا تھا۔ یہاں سے فراغت پانے کے بعد ذرا آگے چلے تو ایک بہت بڑا کمرا آ گیا جس میں ہم سب کا سامان پہلے سے موجود تھا اپنے سامان پر میں نے سیاہ مارکر سے اپنا نام لکھ رکھا تھا اس لیے تلاش کرنے میں ذرا سی بھی وقت نہیں ہوئی۔ میرے بیگ پہیے والے تھے اس لیے میں آسانی سے گھسیٹتے ہوئے ٹرمینل کے خارجی رستے کی طرف چل پڑا مجھے ایک دوست نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ عمرہ کرنے جاؤ تو اپنے ساتھ پہیے والے بیگ لے کر جانا کیونکہ وہاں بار بار سامان اٹھانا پڑتا ہے۔ ٹریول ایجنسی والے شاہ صاحب نے کہا تھا کہ ایئر پورٹ کے باہر ایک شخص پاگلوں کی طرح ''الحباش! الحباش!'' کی آوازیں لگاتا نظر آئے گا۔ لیکن یہاں مجھے ایسا کوئی شخص نظر نہیں آیا۔ البتہ عربی لباس پہنے ایک شخص نہایت سنجیدگی اور متانت کے ساتھ میرے قریب آیا۔ آہستہ سے بولا: ''الحباش؟'' میں نے کہا: ''جی'' وہ شاید اردو بھی سمجھتا تھا۔ اس نے مجھے سامنے کھڑی ایک بس کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔ وہاں بہت سی بسیں اور ویگنیں کھڑی تھیں۔ ہم دونوں اپنی بس کے قریب پہنچے۔ ابھی اس میں کئی نشستیں خالی تھی اس لیے شبنم نے اپنی پسند کی نشست سنبھال لی۔ وہ کھڑکی کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ کر ارضِ مقدس کا نظارہ کرنا چاہتی تھی۔ اس بس کا ڈرائیور بھی ''الحباش'' کا آدمی تھا۔ اس نے تمام مسافروں کے پاسپورٹ اپنے پاس رکھ لیے۔ ڈرائیور کا نام محسن تھا اور اس کا تعلق سیالکوٹ سے تھا۔ محسن نے مہربانی یہ کی کہ مجھے اس نے میری خواہش پر اپنے ساتھ والی نشست پر بٹھا لیا۔ بس مکے کی طرف چلی تو بس میں سوار تمام افراد نے تلبیہ اور درود پاک پڑھنا شروع کر دیا۔ میری نظریں باہر تھیں، دل کہیں اور تھا۔ جدہ کو بجا طور پر روشنیوں کا شہر کہا جا سکتا ہے۔ شہر کی تمام سڑکوں کے کناروں پر لاتعداد برقی قمقمے روشن تھے۔ محسن نے بتایا کہ یہاں بجلی تیل سے بنائی جاتی ہے اور تیل کی یہاں کوئی کمی نہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ یہاں بجلی کی لوڈ شیڈنگ کا تصور تک نہیں۔ میں دل ہی میں سوچ رہا تھا کہ وہ ارضِ مقدس جس نے دنیا بھر کے انسانوں

کے سینوں کو منور کیا وہاں اندھیروں کا کیا کام؟ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوبِ خاص، حضرت محمدؐ کی سرزمین کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اندھیروں سے نکال دیا ہے۔

جدّے سے مکے کی طرف

تقریباً دو گھنٹے کی مسافت کے بعد بس مکہ شہر کے اندر داخل ہوگئی۔ بس ایک مسجد کے قریب سے گزری تو ڈرائیور نے بتایا کہ یہ مسجد عائشہؓ ہے۔ اسے بھی میقات کا درجہ حاصل ہے۔ اگر آپ مکے میں ہیں تو مسجد عائشہؓ میں جا کر احرام باندھ لیں۔ عمرے کی نیت کریں۔ دو نفل ادا کریں اور عمرہ کرنے کے لیے حرم شریف چلے جائیں۔ تقریباً تمام عمرہ زائرین کو ان کے ٹریول ایجنٹوں نے الگ الگ ہوٹلوں میں ٹھہرانے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ میں چونکہ سب سے آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا اس لیے میری نظر ایک بہت بڑے کلاک ٹاور پر پڑی۔ رات ایک بجے کا عمل تھا۔ ڈرائیور نے بس ایک ہوٹل کے سامنے روک دی۔ کچھ عمرہ زائرین کو اس ہوٹل میں ٹھہرانے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ اس لیے انھیں وہاں اتار دیا گیا۔ بس چل پڑی تو چند میٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے پھر روک دی۔ یہ ہوٹل ''المسارات الملکۃ'' تھا۔ عربی میں ہوٹل کو فندق کہتے ہیں۔ ہم دونوں کو یہاں اتار دیا گیا۔ میں نے ڈرائیور سے پاسپورٹ واپس مانگے۔ میرا خیال تھا کہ ہوٹل میں کمرا حاصل کرنے کے لیے یہ دکھانا ہوں گے۔ لیکن اس نے بتایا کہ ''الحباش'' والوں کے پاسپورٹ میرے پاس رہیں گے۔ جب آپ واپس جائیں گے تو تب آپ کو یہ لوٹا دیے جائیں گے۔ مجھے شاہ صاحب نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اپنے پاسپورٹوں کی کاپیاں کروا کے اپنے پاس رکھ لیجیے گا۔ کئی بار اصل پاسپورٹ گم ہو جاتے ہیں۔ تب یہ کاپیاں آپ کے کام آتی ہیں۔ میں دونوں پاسپورٹوں کی کئی کاپیاں لاہور ہی سے کروا لایا تھا۔

فندق المسارات المملکۃ

بس ہمیں ''المسارات'' کے سامنے چھوڑ کر آگے چلی گئی۔ ہم دونوں اپنا سامان لے کر ہوٹل میں داخل ہوئے تو کاؤنٹر پر بیٹھے شخص کو ہوٹل کا واؤچر دکھایا جو طواف ٹریول اینڈ ٹوورز والوں نے دیا تھا۔ میں نے احتیاطاً اس کی بھی کئی کاپیاں کرا رکھی تھیں۔ کاؤنٹر پر بیٹھے شخص نے مجھ سے واؤچر لیا۔ اپنا رجسٹر کھولا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس میں پہلے سے میرا اور شبنم کا نام درج تھا۔ ظاہر ہے کہ ٹریول ایجنسیوں کا ہوٹل والوں سے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے ذریعے رابطہ رہتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی ضرورت ہیں۔ کاؤنٹر پر بیٹھا شخص پنجابی لہجے میں اردو بول رہا تھا اس نے ہمیں دوسرے فلور پر واقع ایک کمرے میں جانے کو کہا۔ جب میں نے چابی مانگی تو بولا: ''اس میں پہلے سے ایک فیملی کے تین ارکان موجود ہیں۔ آپ کو ان کے ساتھ رہنا ہوگا۔ اس کی یہ بات سن کر خاصی حیرت ہوئی۔ میں نے کہا کہ ہمیں الگ کمرا دیں تو اس نے میرا واؤچر اٹھایا اور مجھے کہا: ''پڑھیں یہ لکھا ہے۔ Sharing Room اگر کمرا الگ لینا تھا تو اپنے ٹریول ایجنٹ کو بتا دیتے۔ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میرے بچے جس اسکول میں پڑھتے ہیں وہاں مہینے میں ایک بار Sharing Day منایا جاتا ہے۔ سب بچے کھانے پینے کی چیزیں لے کر جاتے ہیں اور مل بانٹ کر کھاتے ہیں۔ انگریزی اسکولوں کی یہ روایت بچوں میں اخوت اور محبت کا جذبہ پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے۔ میں نے چونکہ احرام باندھا ہوا تھا۔ اس لیے کاؤنٹر پر بیٹھے شخص کی بات سن کر مجھے ذرا سا بھی غصہ نہیں آیا۔ ہم نے اپنا سامان اٹھایا اور لفٹ کے ذریعے دوسرے فلور پر پہنچ گئے۔ کمرا نمبر دو سو ایک کے دروازے پر دستک دی تو ایک خاتون نے دروازہ کھولا۔ جب میں نے بتایا کہ ہمیں بھی آپ کے ساتھ اسی کمرے میں رہنا ہے تو

اس نے ہمیں خوش دلی سے اندر آنے کو کہا۔ کمرا چھوٹا سا تھا لیکن اس میں پانچ سنگل بیڈ بچھے ہوئے تھے۔ دو بیڈ خالی تھے ایک بیڈ پر ایک باریش بزرگ اور دوسرے پر ایک اماں جی دراز تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی لگا کہ ان لوگوں کے ساتھ خوب نبھے گی۔ ان کے ساتھ سب کچھ Shar کیا جا سکتا ہے میں نے وہاں پڑے ایک بڑے بیگ پر نظر ڈالی تو اس پر لکھا تھا'' ایم بشیر حسین پورہ غازی آباد لاہور'' جب ہم نے اپنا سامان ایک جگہ رکھ دیا تو میں نے مناسب سمجھا کہ پہلے ہم ایک دوسرے سے متعارف ہو جائیں تاکہ وقت اچھا گزر سکے۔ میں نے اپنا اور شبنم کا تعارف کرایا۔ بابا جی نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ وہ گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سروس (جی ٹی ایس) میں کنڈکٹر تھے آخری بس سٹاپ کرشن نگر تک جانے والی بس میں خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ بابا جی دھیمے مزاج کے آدمی تھے۔ ہر بات مسکرا کر کرتے اور شگفتہ طبیعت کے مالک تھے۔ ہلکا پھلکا مذاق بھی کر لیتے تھے۔ ان کی بیگم صاحبہ ان پڑھ ہونے کے باوجود سمجھ بوجھ رکھنے والی خاتون تھیں۔ شبنم نے انھیں اماں جی کہہ کر پکارا تو میں بھی انھیں اماں جی ہی کہنے لگا۔ ان کی بیٹی کا نام شازیہ تھا اور وہ فیصل آباد میں بیاہی ہوئی تھی۔ اسے اس کے شوہر نے عمرے پر بھیجا تھا۔ وہ تینوں ہم سے ایک دن پہلے پہنچے تھے اس لیے عمرہ کر چکے تھے۔

ہم دونوں کو بھی اور اسی وقت عمرہ کرنے کے لیے حرم شریف پہنچنا تھا۔ چنانچہ دونوں نے اسی وقت وضو کیا اور تقریباً رات کے ڈیڑھ بجے حرم شریف کی طرف چل پڑے۔ آدھی سے زیادہ رات بیت چکی تھی۔ لیکن اس کے باوجود شارع ابراہیم خلیلؑ پر چہل پہل تھی۔ لوگ گروہ در گروہ حرم شریف کی طرف جا بھی رہے تھے اور ادھر سے آ بھی رہے تھے۔ رات کے وقت بھی دن کا سماں تھا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں جنت میں آ گیا ہوں۔ روح پرور فضا جیسے الفاظ کئی بار پڑھے تھے لیکن اب پہلی بار مجھے تجربہ ہوا تھا کہ روح پرور فضا ہوتی

کیا ہے؟ ہر طرف نور ہی نور، روشنی ہی روشنی، برکت ہی برکت تھی۔ لوگ اپنی اپنی ذات کو بھلا کر باری تعالیٰ کے حضور پیش ہونے کے لیے سر پھوڑائے چلے جا رہے تھے۔

حاضر ہوں میں حاضر ہوں میں اے حاضر و ناظر!

شارع ابراہیمؑ خلیل

مَیں نے اچانک سر اُٹھا کر دیکھا تو مجھے اپنے سامنے وہی کلاک ٹاور دکھائی دیا جو مجھے بس کے اندر سے دکھائی دیا تھا۔ اپنے اردگرد دیکھا تو رات کے ڈیڑھ بجے بھی دکانیں کھلی تھیں۔ یہ دکانیں سامان سے اَٹی ہوئی تھیں۔ لوگ رُک رُک کر دکانوں کے باہر اور اندر پڑا سامان دیکھ رہے تھے۔ کچھ بھاؤ تاؤ کر رہے تھے اور کچھ بھاؤ تاؤ کیے بغیر خرید رہے ہیں۔ مجھے لگا کہ مَیں کسی شاپنگ مال میں آ گیا ہوں۔ آج پہلی بار ہُوا تھا کہ شبنم کسی دکان پر نہیں رُکی تھی۔ اُس نے سامان دیکھنے کی خواہش کی نہ خریدنے کی، شاید وہ بھی میری طرح جلد از

جلد حرم شریف پہنچنا چاہتی تھی۔ بھری پُری دکانیں دیکھ کر اُس نے کہا: ''ہمیں کسی سے حرم شریف کا راستہ پوچھ لینا چاہیے''۔ بات اُس کی ٹھیک تھی۔ مَیں خود سوچ رہا تھا کہ چلتے چلتے ہم حرم شریف کے بجائے کہیں اور نہ پہنچ جائیں۔ احرام باندھے ہوئے لوگ اُدھر ہی جا رہے تھے جدھر ہم محوِ خرام تھے اور اُدھر سے احرام باندھے ہوئے لوگ آ بھی رہے تھے اس لیے مجھے یقین تھا کہ حرم شریف اِدھر ہی ہوگا، لیکن دِل کی تسلی کے لیے مَیں نے ایک دکان دار سے حرم شریف کا راستہ پوچھا تو اُس نے کلاک ٹاور کی طرف جانے کا اشارہ کر دیا۔ جب ہمیں یقین ہو گیا کہ ہم درست سمت میں جا رہے ہیں تو ہماری رفتار تیز ہو گئی۔ ہمیں محسوس ہو رہا تھا کہ ہم رفتہ رفتہ بلندی کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ سڑک گھاٹی پر بنی ہوئی ہے۔ چند سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہمیں اپنے دائیں طرف ایک بڑا راستہ دکھائی دیا۔ ہم اِس کے اندر داخل ہو گئے۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی حرم شریف کے مینار ہمیں دکھائی دینے لگے۔ اب کلاک ٹاور ہمارے سروں پر تھا۔ ہم اور تیز تیز آگے بڑھنے لگے۔ مجھے تو یوں لگ رہا تھا جیسے میرا دِل میرے پاؤں میں دھڑک رہا ہے اور مجھے جلد از جلد بیت اللہ کے قریب لے جانا چاہتا ہے۔ یہاں پہلی دفعہ آنے والے ہر آدمی کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہوگا۔ حرم شریف کے قریب بھی دکانیں کھلی تھیں۔ لوگ چائے، کافی، جوس اور سوفٹ ڈرنک خرید کر پی رہے تھے۔ بڑے بڑے جنرل سٹور اور میڈیکل سٹور رات کے وقت بھی کُھلے تھے۔

اللہ کے گھر میں

چند لمحوں کے بعد ہم دونوں حرم شریف کے بابِ ملک فہد کے سامنے کھڑے تھے۔ دروازے کے ایک طرف ایک شُرطہ ڈھیلے ڈھالے لباس میں، ڈھیلے ڈھالے انداز میں کھڑا تھا۔ اُسے دیکھ کر پہلے تو ہم ڈر گئے کہ کہیں وہ ہمیں اندر جانے سے روک ہی نہ دے، کسی کے

گھر جانے کا بھلا یہ کون سا وقت ہے؟ رات کے پونے دو بج رہے تھے۔ پھر خیال آیا کہ یہ کسی کا گھر نہیں، یہ میرے اللہ کا گھر ہے، جس میں داخل ہونے کے لیے کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ یہاں ہم کسی بھی وقت آ سکتے ہیں۔ یہ ہمارے دُنیاوی خداؤں کا وتیرہ ہے کہ اپنے گھروں میں عام لوگوں کو داخل ہونے سے منع کر دیتے ہیں۔ ان کے رکھے ہوئے دربان آنے والوں کو یہ کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں کہ "صاحب میٹنگ میں ہیں"۔ ہمارا اللہ بھی اپنے فرشتوں کے ساتھ میٹنگیں کرتا ہے، لیکن وہ اپنی مخلوق کی طرف سے کبھی غافل نہیں ہوتا۔ سب کی سنتا ہے۔ سب کو آنے دیتا ہے۔ ہم بھی اللہ کے مہمان تھے۔

ہم دونوں نے اپنے جوتے دروازے کے ساتھ ہی پڑے بہت سے جوتوں کے درمیان ایک طرف کر کے رکھ دیے۔ ایک ساتھ اتنے جوتے مَیں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ ہر رنگ اور ہر سائز کے مردانہ اور زنانہ جوتے وہاں موجود تھے۔ یہی حال وہاں موجود زائرین کا تھا۔ دُنیا بھر کے لوگ وہاں دکھائی دے رہے تھے۔ انڈونیشیا، ملائشیا، چین، بھارت، بنگلہ دیش، ایران اور ترکی کے لوگ تو صاف پہچانے جاتے تھے۔ پاکستانیوں کی بھی وہاں کمی نہ تھی۔ پاکستانی جب اپنے ساتھیوں سے اُردو یا پنجابی میں بات کرتے ہوئے ہمارے قریب سے گزرتے تو مَیں ایک بار چونک کر ان کی طرف ضرور دیکھتا تھا کہ شاید کوئی جان پہچان والا ہو، لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ یہاں میرا اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ حرم شریف کے اندر دیواروں پر جگہ جگہ لوگوں کی رہنمائی کے لئے معلوماتی بورڈ لگے ہوئے تھے۔ ہمیں خانہ کعبہ کے گرد سات چکر پورے کرنا تھے اس لیے ہم بورڈ پڑھتے پڑھتے مطاف کی طرف رواں دواں تھے۔ رات کے وقت بھی انسانوں کا ایک ہجوم تھا۔ ہجوم کو چیرتے ہوئے بالآخر ہم دونوں اُس جگہ پہنچ گئے جہاں پہنچ کر انسان آنکھیں جھپکنا بھول جاتا ہے۔ جہاں پہنچ کر یا تو وہ ساکت ہو جاتا ہے یا تڑپتا ہے، روتا ہے، بلکتا ہے۔ اللہ کا گھر

میرے سامنے تھا۔ ملزم حاضر تھا۔ منصفِ اکبر کی عدالت کی دیواروں پر پڑے سیاہ غلاف نے میری آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ یہ عجیب روشنی تھی، جو سیاہی سے پھوٹ رہی تھی۔ الفاظ بھی سیاہ ہوتے ہیں لیکن روشنی لٹاتے ہیں۔ نورِ سحر بھی رات کی آغوش سے پھوٹتا ہے۔ شکمِ مادر کی تاریکی میں پانی کا ایک قطرہ زندگی کا نور بنتا ہے اور کائنات میں اپنے حصے کا نور بکھیرتا ہے۔ بیج مٹی کی تاریکی میں پلتا ہے اور ثمر اور گل کی شکل میں نورِ خداوندی کا مظہر بنتا ہے۔ کعبے کو اپنے سامنے پا کر مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ مجھے اپنے رب سے اپنے کون کون سے گناہ کی معافی مانگنا تھی۔ سب کچھ بھول گیا تھا۔ مَیں یہ بھی بھول گیا تھا کہ میرے ساتھ کوئی ہے۔ اِس "کوئی" نے زور سے، بھینچ کر میرا ہاتھ تھاما ہُوا تھا۔ وہ گُم ہو چکی تھی، لیکن پھر بھی گم نہیں ہونا چاہتی تھی۔ مَیں خود بھی کہیں کھو گیا تھا۔ جو خود کھو گیا ہو وہ کسی کو کھو جانے سے کس طرح بچا سکتا ہے؟ مَیں پتھر کا ہو چکا تھا۔ ساکت تھا۔ پلکیں جھپکنا بھول گیا تھا، لیکن میرے سینے میں دِل دھڑک رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے مَیں مَر چکا ہوں اور میری لاش کفن میں لپٹی، ایک لمبوتری سی چارپائی پر پڑی ہے۔ میرا سب کچھ چھن چکا ہے، صرف قوتِ سماعت باقی ہے اور کوئی ہے جو روتے ہوتے دُعا مانگ رہا ہے:

"یا اللہ میرے والدین، میرے بہن بھائیوں، اُن کے بچوں، میرے رشتے داروں، دوستوں، محلے داروں، شاگردوں، ملنے والوں اور اہلِ وطن کی ساری دُعائیں آج قبول کر لے! مجھے تجھ سے اور کچھ نہیں چاہیے"۔

مجھے محسوس ہوا کہ یہ تو میری اپنی صدا تھی۔ میرے دِل کی آواز تھی، جو مجھے آ رہی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ میرے دِل کی یہ صدا، اُس نے ضرور سُن لی ہوگی، جس نے میرا دِل بنایا ہے۔

جب ذرا ہوش میں آیا تو مجھے خیال آیا کہ مَیں تو اپنے گناہ بخشوانے منصفِ اکبر کے سامنے حاضر ہُوا تھا۔ پھر یہ سوچ کر دِل کو ڈھارس بندھائی کہ جو اوروں کے لیے مانگتا ہے

اُس کا دامن کبھی خالی نہیں رہتا، جو دوسروں کی بھلائی چاہتا ہے اُس کا بھلا، آپ ہی آپ ہو جاتا ہے۔مَیں نے اُس کی طرف دیکھا، جس نے زور سے بھینچ کر میرا ہاتھ تھاما ہُوا تھا۔اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ہونٹ پھڑپھڑا رہے تھے۔دِل میں کیا تھا؟ وہی جانتی تھی۔

شاعر کی حاضری

پھر مجھے اپنی ایک نظم ”شاعر کی حاضری“ یاد آ گئی، جومَیں نے عالمِ تخیل میں خانۂ خدا میں حاضری کے وقت کہی تھی: آپ بھی پڑھ لیجیے۔

حاضر ہوں مَیں حاضر ہوں مَیں اے حاضر و ناظر!
کیا تجھ سے کہوں؟ تجھ پہ سب احوال ہے ظاہر
ایمان و عقیدہ مرا تجھ سے ہے مکمل
ہوں ماننے والا مَیں ترا اوّل و آخر
آیا ہوں ترے گھر میں تو شکوہ بھی کروں گا
ویسے تو مَیں ہوں تیری عنایات پہ شاکر
دُنیا کے خداؤں سے مَیں کیوں ڈرنے لگا ہوں؟
کیوں اپنی اداؤں میں ہوا جاتا ہوں کافر؟
کیوں صحنِ چمن پر مجھے مقتل کا گماں ہے؟
کیوں عام ہوئے جاتے ہیں خوں رنگ مناظر؟
غیروں پہ عنایاتِ فراواں ہے مسلسل
کب مجھ پہ کھلیں گے تری قدرت کے مظاہر؟
کیوں حاکم و منعم ہوے اَغراض کے بندے؟

کہتے ہیں : ”خُدا آپ کا ہو حامی و ناصر“
کیوں میرے رقیبوں کو ملی منزلِ مقصود
مَیں کس لیے اُلجھے ہوئے رستوں کا مسافر؟
جو بات کہی ہے دِلِ مسلم کی صدا ہے
کہنے کو مَیں اِس عہد کا دیوانہ سا شاعر

طواف کے سات چکر

جی تو یہی چاہتا تھا کہ خانہ کعبہ کو دیکھتا رہوں۔اس سے باتیں کرتا رہوں، لیکن کھو جانے کے باوجود مجھے یاد تھا کہ مَیں عمرہ کرنے آیا ہوں۔ابھی طواف کے سات چکر پورے کرنا ہیں۔طواف کے آغاز کے لیے ہم دونوں خانہ کعبہ کے دائیں طرف چلے تو اس کا وہ کونا ہمارے سامنے آ گیا، جس میں حجرِ اسود نصب ہے۔یہیں سے طواف کا آغاز ہوتا ہے۔تلبیہ پڑھتے ہوئے ہم دونوں اینٹی کلاک وائز آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ہمارے دائیں بائیں، آگے پیچھے لوگ ہی لوگ تھے۔رات کے وقت بھی وہاں دن کا سماں تھا۔آسمان کی طرف دیکھا تو وہ بھی نور میں نہایا ہوا تھا۔کچھ لوگ اپنے ساتھ دُعاؤں کی کتابیں لائے ہوئے تھے۔وہ بلند آواز میں یہ دُعائیں پڑھتے جاتے تھے۔ایک نہایت بوڑھے شخص کو مَیں نے دیکھا۔غالبًا بنگلہ دیشی تھا۔چہرے مُہرے سے اَن پڑھ دکھائی دیتا تھا۔اُس کا جوان بیٹا اُس کے ساتھ تھا۔اُس کا بیٹا ایک کتاب سے بلند آواز میں عربی میں کچھ دُعائیں پڑھتا جاتا تھا اور اس کا باپ اُسے دہراتا جاتا تھا۔وہ عمرہ یقینًا پہلے کر چکے تھے۔لیکن اب طواف کر رہے تھے۔

طواف کرتے ہوئے ہم جب بھی حجرِ اسود کے قریب سے گزرتے دوسرے لوگوں کی

طرح ہم بھی ہاتھ سے اس کی طرف اشارہ کرتے۔ اشارہ کرنے کے اس عمل کو استلام کہتے ہیں۔ حجرِ اسود والے کونے سے آگے آدھے دائرے کی شکل میں ایک دیوار بنی ہوئی ہے۔ اِس دیوار کے اندرونی حصے کو حطیم کہتے ہیں اور یہ اندرونی حصہ خانۂ کعبہ کا حصہ شمار ہوتا ہے۔ طواف کے دوران میں، ہم حطیم میں نہیں گئے، لیکن دِل ہی دِل میں طے کرلیا تھا کہ عمرہ مکمل کرنے کے بعد یہاں نماز ضرور پڑھیں گے۔ اس حصے میں پڑھی گئی نماز کا ثواب خانۂ کعبہ کے اندر پڑھی گئی نماز کے برابر ہے۔ اس کے قریب ہی مقامِ ابراہیمؑ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دونوں قدموں کے نشانات کو اللہ تعالیٰ نے ایک پتھر پر محفوظ کرکے اِسے مقامِ ابراہیمؑ قرار دیا۔ اِس پتھر کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانی قرار دیا ہے۔ ہمارے پیارے نبی حضرت محمدؐ کے حکم سے یہ پتھر خانۂ کعبہ کے دروازے کے سامنے نصب ہے۔ اب اِس پتھر کو نہایت خوبصورت سبز جالیوں میں محفوظ کردیا گیا ہے۔ طواف کے بعد یہاں نماز ادا کرنے کا حکم ہے۔ ہم دونوں طواف کر رہے تھے اور تلبیہ پڑھتے جا رہے تھے:

ترجمہ: ''حاضر ہوں، یا اللہ میں حاضر ہوں، حاضر ہوں کہ تیرا کوئی شریک نہیں، حاضر ہوں بے شک، حمد اور نعمت اور بادشاہت صرف تیرے لیے ہی ہے۔ تیرا کوئی شریک نہیں ہے'' جب سات چکر پورے ہوگئے تو مقامِ ابراہیمؑ کے قریب دو رکعت نماز ادا کی۔

صد شکر کہ اب دل پہ کوئی بوجھ نہیں ہے

آبِ زم زم کا معجزہ

سات چکر پورے ہوگئے تو شبنم نے بتایا کہ طواف مکمل ہوگیا۔ اگر وہ مجھے نہ بتاتی تو میں شاید خانۂ کعبہ کے گرد چکر کاٹتا رہتا۔ میری گنتی ہمیشہ سے کمزور رہی ہے۔ ویسے بھی شاعر اعداد کا نہیں، لفظوں کا رسیا ہوتا ہے۔ اعداد قیمتی ضرور ہوتے ہیں، لیکن ان میں لفظوں کی طرح روح نہیں ہوتی۔

یہ پہلی بار ہوا تھا کہ میں بہت دیر سے کچھ کھائے پیے بغیر اتنا چلا تھا، جو کھایا تھا، جہاز میں کھایا تھا، بھوک کا احساس ضرور تھا، لیکن یہ احساس ابھی مجھ پر غالب نہیں آیا تھا۔ ابھی

صفااورمروہ کی پہاڑیوں کے درمیان سعی کا مرحلہ باقی تھا۔مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ صفااور مروہ کی پہاڑیاں، کعبے کے نزدیک ہی ہیں اس لیے مَیں نے کسی سے پوچھنے کے بجائے حرم کی دیوار پر لکھی ہوئی ایک تحریر سے راہ نمائی لی۔جلی حروف میں سعی کا لفظ لکھا ہوا تھا اور تیر کا نشان بتا رہا تھا کہ کس طرف جانا چاہیے۔ہم دونوں اِسی سمت چل پڑے۔اپنے دائیں طرف دیکھا تو وہاں بڑے بڑے واٹر کولر پڑے ہوئے تھے۔ان میں آبِ زم زم تھا۔کسی میں ٹھنڈا اور کسی میں تازہ۔ساتھ ہی لاتعداد ڈسپوزایبل گلاس رکھے ہوئے تھے۔لوگ بیٹھ کر گلاس میں پانی بھرتے اور کھڑے ہوکر پینے لگتے۔آبِ زم زم کھڑے ہوکر ہی پینے کا حکم ہے۔حرم میں داخل ہونے کے بعد ہم نے ابھی تک آبِ زم زم نہیں پیا تھا۔سو وہاں رُک گئے۔اتنے ہجوم کے باوجود گلاس اور آبِ زم زم آسانی سے مل گیا۔ہم دونوں نے کھڑے ہوکر جی بھر کے پانی پیا اور حضرت حاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو یاد کیا۔ہم نے اپنے اپنے گلاس میں بار بار آبِ زم زم بھرا اور پیا۔پانی پیتے ہی یوں لگا جیسے پیاس کے ساتھ ساتھ میری بھوک بھی مٹ گئی ہے۔عام طور پر خالی پیٹ پانی پیا جائے تو طبیعت خراب ہوجاتی ہے،لیکن یہاں معاملہ کچھ اور تھا۔اس پانی میں اللہ تعالیٰ نے شفا بھی رکھی ہے اور غذا بھی۔یہ پیاسوں کی پیاس اور بھوکوں کی بھوک مٹاتا ہے۔بیماروں کو تن درست کرتا ہے۔وہاں موجود لوگ اپنے مُنہ اور سر پر آبِ زم زم لگا رہے تھے۔مَیں بھی چاہتا تھا کہ اپنے سر پر لگاؤں،لیکن مَیں ایسا نہیں کرسکا،کیونکہ مجھے سعی کے بعد اپنے سر کے بال اتروانا تھا۔مَیں نہیں چاہتا تھا کہ زم زم لگے میرے بال کوڑے کے ڈھیر میں چلے جائیں۔

آبِ زم زم ربِ کعبہ کا معجزہ ہے اور اس کی منصفانہ ترسیل،سعودی حکام کا کارنامہ ہے۔آپ کو وہاں پڑے ہزاروں واٹر کولروں میں سے ایک بھی خالی نہیں ملے گا۔ڈسپوزایبل گلاس ہر وقت لاکھوں کی تعداد میں موجود رہتے ہیں۔ہر گلاس بس ایک بار

استعمال ہوتا ہے۔استعمال کے بعد یہ کچرے کے ڈھیر میں چلے جاتے ہیں۔وہاں ہر وقت خادم موجود رہتے ہیں،جو خالی کولر کی جگہ فوراً بھرا ہوا کولر رکھ دیتے ہیں۔ڈسپوزایبل گلاس ختم ہوں تو نئے رکھ دیتے ہیں۔سعی کے لیے صفا کی پہاڑی کی طرف جاتے ہوئے خادمین حرم کی چستی اور پھرتی کے مناظر قدم قدم پر دیکھنے میں آئے۔

صفا و مروہ کی سعی

راہ نمائی کے لیے لگے سبز رنگ کے بورڈ پڑھتے پڑھتے ہم صفا کی پہاڑی کے پاس پہنچ گئے۔صفا کی پہاڑی کو ایک نہایت شفاف اور موٹے شیشے میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔لوگ اسے چھوسکتے ہیں، نہ اس پر چڑھ سکتے ہیں۔حرم شریف کی عمارت یوں بنائی گئی ہے کہ صفا اور مروہ کی دونوں پہاڑیاں عمارت کے اندر ہی شامل ہوگئی ہیں۔ان دونوں تک پہنچنے میں کسی کو کوئی مشکل نہیں اٹھانا پڑتی۔مَیں سمجھتا تھا کہ صفا کی پہاڑی تک جاتے جاتے کنکروں اور پتھروں سے میرے پاؤں زخمی ہوچکے ہوں گے۔شدید گرمی سے مَیں بے حال ہوں گا۔سر پر سورج چمک رہا ہوگا،لیکن یہاں ایسا کچھ بھی نہ تھا۔فرش ٹھنڈا ہے،سر پر چھت ہے،ہر وقت اے سی چلتے رہتے ہیں۔ہاں حضرت حاجرہؓ کے زمانے میں،صفا اور مروہ کا درمیانی فاصلہ طے کرنا واقعی ایک کڑا امتحان رہا ہوگا۔تبھی تو ان کی تڑپ کو حج اور عمرے کا حصہ بنایا گیا ہے۔مجھ ایسے گناہ گار صفا اور مروہ کے درمیان ایک ماں کی تڑپ کو یاد کرنے کے لئے سعی تو کر لیتے ہیں،لیکن ماؤں کو تڑپانے سے باز نہیں آتے۔ماں اپنی ہو یا کسی اور کی،اگر ہم نے اس کو تڑپایا ہے تو ہمارا حج اور عمرہ بے کار ہے۔

کچھ لوگ صفا کی پہاڑی کے نزدیک جائے نماز بچھا کر اور کچھ ٹھنڈے فرش ہی پر نفل ادا کر رہے تھے۔ایرانی اور تُرک باجماعت نفل ادا کرتے نظر آئے۔

ہم دونوں صفا سے مروہ کی طرف چل پڑے۔سعی کا آغاز ہو گیا تھا،لیکن یہ کیسی سعی تھی کہ ہم آبِ زم زم پی کر اپنی بھوک اور پیاس مٹا چکے تھے۔مزہ تو تب تھا کہ مَیں بھوکا پیاسا رہ کر سعی کرتا۔مَیں اپنی بھول پر دل ہی دل میں پشیمان تھا۔ذرا سا چلے تو ایک جگہ سبز رنگ کی ٹیوب لائٹس لگی ہوئی دکھائی دیں۔یہاں مرد کو ذرا تیز چلنے کا حکم ہے۔عورت اس حکم سے مستثنیٰ ہے۔سو مَیں کچھ تیز تیز چلنے لگا۔یہ تیزی،مروہ کی پہاڑی تک پہنچنے اور پھر صفا کی پہاڑی کے قریب موجود پیاس سے بلکتے حضرت اسماعیل تک حضرت حاجرہ کے جلد از جلد واپس آنے کی یادگار ہے۔مروہ تک پہنچنے میں تقریباً پانچ منٹ لگے۔ہمارا ایک چکر پورا ہو گیا تھا۔مجھے لگا کہ یہاں ہمیں رعایت دے دی گئی ہے۔صفا سے مروہ اور مروہ سے صفا تک ایک چکر پورا ہوتا ہے،لیکن فاصلہ زیادہ ہونے کے باعث حاجیوں اور عمرہ کرنے والوں کو یہ رعایتی پیکیج دیا گیا ہے۔حضرت حاجرہؓ نے یہاں پورے سات چکر لگائے تھے، اور ہم ساڑھے تین چکروں کو سات چکر شمار کرتے ہیں۔ذرا سوچیے کہ تب یہاں زمین کیسی پتھریلی اور گرم تھی۔ہر طرف کنکر،پتھر اور ریت ہوگی۔سر پر سورج چمک رہا ہوگا،ننگے پاؤں صفا اور مروہ کے درمیان اپنے پیاسے بچے کے لیے پانی کی تلاش میں بغیر گنے سات چکر کاٹنا کوئی آسان کام نہ تھا۔

مروہ کی پہاڑی کے قریب جا کر ہجوم یک دم بڑھ گیا،سبب اس کا یہ تھا جن کے سات چکر پورے ہو گئے تھے،وہ وہاں کھڑے ہو کر اپنے ساتھ آئی،خواتین کے سروں سے ایک پور کے برابر بال کاٹ رہے تھے یا وہاں کھڑی عرب خواتین سے کٹوا رہے تھے۔یہ خواتین اپنی عبایا یا پرس میں چھپا کر چھوٹی قینچیاں اپنے ساتھ لے آتی ہیں اور دو چار ریال لے کر خواتین کے بال کاٹتی ہیں۔سعی کے بعد بال کٹوانا چونکہ لازم ہے اس لیے ان خواتین کی خوب چاندی ہوتی ہے۔شبنم کی طرف بھی ایک لڑکی قینچی لے کر آئی،لیکن اس نے اشارے

سے روک دیا،کیونکہ ابھی اس کے سات چکر پورے نہیں ہوئے تھے۔تجربہ کار عمرہ زائرین اپنے ساتھ ایک چھوٹی قینچی ضرور لاتے ہیں۔

اس ٹھنڈے ٹھار میں ماحول میں اور پکے فرش پر چلتے ہوئے ہم دونوں دوبارہ صفا کی پہاڑی تک پہنچ گئے۔ساتویں چکر کے آخر میں ہم مروہ کی پہاڑی پر آ کر رُک گئے۔یہاں ہم دونوں نے دو دو نفل ادا کیے۔ایک پاکستانی خاتون اپنے ساتھ آئی ہوئی دوسری خاتون کے بال کاٹ کر قینچی اپنے پرس میں رکھنے ہی لگی تھی کہ شبنم کی اس پر نظر پڑ گئی۔اُس نے ایک لمحے کے لئے قینچی عاریتاً مانگ لی اور میرے ہاتھ میں تھما دی۔مَیں نے جلدی سے اس کے بالوں کے آخری کونے سے ایک اُنگلی کی ایک پور کے برابر بال کاٹ دیے۔اس کا عمرہ مکمل ہو گیا تھا۔مجھے اپنا پورا سر منڈوانا تھا۔موبائل کی سکرین دیکھی تو رات کے تقریباً اڑھائی بج رہے تھے۔دیواروں پر لگے بورڈوں سے راہنمائی لیتے ہوئے ہم بالآخر حرم شریف کے اسی دروازے تک پہنچ گئے،جس سے ہم اندر داخل ہوئے تھے۔ہمارے جوتے وہیں رکھے تھے،جہاں ہم نے رکھے تھے۔

دروازے سے باہر نکلے تو میرا احرام دیکھ کر کئی لوگ میری طرف لپکے۔یہ حجام تھے،وہ سب مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے اور صرف دس ریال کے عوض میرا سر مونڈنا چاہتے تھے۔یہ سب پاکستانی تھے۔کوئی اُردو میں گاہکوں کو اپنی طرف بُلا رہا تھا،کوئی پنجابی میں۔ مجھے ملتانی نائی پسند آیا۔وہ مجھے زم زم ٹاور کے اندر ایک دکان پر چھوڑ کر دوبارہ گاہکوں کو گھیرنے چلا گیا۔اب یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ کمیشن پر کام کرتا تھا یا اُنھی کا ملازم تھا۔دکان کے اندر کئی کرسیاں رکھی تھیں اور ایک ہی وقت میں کئی لوگ عمرہ کرنے والوں کے سر مونڈ رہے تھے۔نائی نوجوان لڑکے تھے۔سرائیکی زبان میں خوش گپیاں بھی کر رہے تھے اور اپنا کام بھی۔ہمارے سرور نائی کی طرح یہ گاہک سے زیادہ بات نہیں کر رہے تھے۔شاید

جانتے تھے کہ گھوڑے اور گھاس میں دوستی ہو گئی تو گھوڑا کھائے گا کیا؟ شبنم میرا اور اپنا بیگ لے کر دکان کے باہر پڑے بنچ پر بیٹھی تھی۔ میرے بیگ میں سے اُس نے دس ریال نکالے اور میرے حوالے کر دیے۔ مَیں نے نائی کو دس ریال دیے تو بولا: ''بہت مہربانی حاجی صاحب!''

مجھے اس کی بات سُن کر کوئی حیرت نہیں ہوئی، کیونکہ حرم شریف میں طواف اور سعی کرتے ہوئے اِردگرد موجود شرطے کئی بار مجھے اوحجی! اوحجی! کہہ کر مخاطب کر چکے تھے۔ سعودی عرب میں عمرہ کرنے والوں کو بھی حاجی ہی کہا جاتا ہے۔ ویسے بھی عمرے کو حجِ اصغر کہا جاتا ہے۔ گویا ہم دونوں نے حج کر لیا تھا۔

رات کے تقریباً تین بجے بھی شارع ابراہیم خلیل پر دن کا سماں تھا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ رات کا آخری پہر ہے۔ عورتوں مردوں اور بچوں کی چہل پہل تھی۔ اتنے طویل سفر اور کھانا نہ کھانے کے باوجود ہم ہشاش بشاش تھے۔

ہم دونوں ایک دوسرے کو دِل ہی دِل میں عمرہ کرنے کی مبارکباد دے رہے تھے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے مَیں خلا میں چل رہا ہوں۔ دِل سے سارا بوجھ اُتر گیا ہے۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ عدالتِ اکبر کے منصفِ اکبر نے مجھے تمام الزامات سے بَری کر دیا ہے۔ میری چال میں اعتماد آ گیا تھا۔ مجھے اب پتا چلا کہ قدم بھوک پیاس سے نہیں، گناہوں کے بوجھ سے لڑکھڑاتے ہیں۔ مَیں تو اب زیرو میٹر گاڑی کی طرح بہت مزے سے اپنے ہوٹل کی طرف رواں دواں تھا، شاید شبنم کی بھی یہی کیفیت ہو۔ ہوٹل میں پہنچ کر ہم دونوں میاں بیوی بن گئے۔

آخر گناہ گار نے کعبے کو چھو لیا

کبوتر چوک

دروازے پر دستک ہوئی تو ہماری آنکھ کھلی۔ صبح کے ساڑھے سات بج رہے تھے۔ بابا بشیر اپنی بیگم صاحبہ اور بیٹی کے ساتھ ساری رات حرم شریف میں گزار کر لوٹ آئے تھے۔ میری نیند پوری نہیں ہوئی تھی، اس کے باوجود تھکن کا ذرا سا بھی احساس نہ تھا، چنانچہ غسل کے بعد ہم دونوں پھر سے حرم شریف جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ ناشتا بھی کرنا تھا۔ شارع ابراہیم خلیل ایک بار پھر ہمارا راستہ بنی۔ منزل خانہ کعبہ تھا، یہ آٹھ بجے کا وقت تھا، راستے میں ایک پاکستانی ہوٹل دکھائی دیا، گرما گرم روٹی اور لذیذ پائے کھائے تو لاہور کی یاد تازہ ہو گئی۔ ناشتے کے ساتھ آبِ زم زم پیا۔ شبنم رات کو حرم شریف سے ایک بوتل بھر لائی

تھی ۔بعد میں بھی وہ یہی کرتی رہی ۔ جب بھی حرم شریف جاتی، دو تین بوتلیں ساتھ لے جاتی اور بھر کر اپنے ساتھ رکھتی ۔ پینے کے بعد بچ جاتا تو کمرے میں پڑے فریج میں رکھ دیتی ۔ہم بھی پیتے اور بابا بشیر کی فیملی بھی پیتی ۔

ناشتے کے بعد خانہ کعبہ کی طرف دوبارہ روانہ ہوئے تو چند قدم چلنے کے بعد کبوتر چوک آ گیا ۔ہزاروں جنگلی کبوتر دانہ چگ رہے تھے،حبشی عورتیں ادھر ادھر پھرتے ہوئے، چھپتے چھپاتے شاپنگ بیگز میں پیک کر کے دانہ فروخت کر رہی تھیں ۔ہم نے بھی پانچ ریال کا دانہ وہاں ڈال دیا۔کچھ خواتین وہاں سے خاص قسم کے کچھ دانے چن رہی تھیں ۔شبنم نے ان سے اس کا سبب پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ جن خواتین کے ہاں اولاد نہیں ہوتی یہ کھائیں تو ان کی گود ہری ہو جاتی ہے، یہ سن کر شبنم نے بھی وہاں سے وہ مخصوص دانے چننا شروع کر دیے ۔شاید اپنی اُن سہیلیوں کے لیے جو ابھی تک اولاد سے محروم تھیں ۔

کعبے کو چھولیا

کبوتر چوک سے نکلے تو ہم ایک بار پھر باب ملک فہد کے سامنے تھے ۔سر اٹھا کر دیکھا تو زم زم ٹاور ہمارے سروں پر تھا۔ہم نے اپنی جوتیاں ایک بار پھر وہیں رکھ دیں جہاں کل رات رکھی تھیں اور ایک بار پھر کعبے کے روبرو پہنچ گئے ۔رات میں ملزم کے طور پر یہاں حاضر ہوا تھا،اب میں پہلے والا ناصر بشیر نہیں تھا، کچھ اور تھا۔کل اس کالے گھر کا رعب داب مجھ پر طاری تھا،آج یہ خود مجھے پاس بلا رہا تھا۔مجھے لگ رہا تھا جیسے میری اور اس کالے گھر کی دوستی ہو گئی ہے ۔ہم ایک بار پھر حجر اسود کے سامنے آن کھڑے ہوئے ،حجرِ اسود مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔صبح کا وقت تھا،اس لیے "حاجیوں" کا زیادہ رش نہیں تھا۔شبنم نے میرا بازو تھاما اور ہم طواف کرتے ہوئے لوگوں میں شامل ہو گئے ۔ پہلے ہی چکر میں ہم حجر اسود کے قریب

پہنچ گئے، میں نے شبنم کو دونوں بازوؤں سے تھام کر حجر اسود کے قریب کر دیا۔پہلے اس نے جنت کے اس پتھر کا نظارہ کیا پھر جلدی سے اس کو ہاتھ لگایا اور اپنے منہ پر پھیر لیا۔اسی اثنا میں پیچھے سے کسی نے میرا بازو پکڑ لیا، میں سمجھا کہ کوئی شرطہ ہے جو مجھے پیچھے دھکیلنا چاہتا ہے لیکن مڑ کر دیکھا تو وہ ایک نوجوان لڑکی تھی ۔اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ میں حجرِ اسود کے قریب پہنچ ہی جاؤں گا۔جب میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اس نے میرا بازو چھوڑ دیا۔وہ شاید ڈر گئی تھی ۔میں نے اسے اشارہ کر کے کہا کہ کوئی بات نہیں،تھام لو،اب اس نے نہایت بے تابی سے میرا بازو پہلے سے بھی زیادہ طاقت سے تھام لیا۔اسی دوران میں شبنم حجرِ اسود کے قریب سے ہٹی تو میں آگے بڑھا۔حجرِ اسود لوگوں کے پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔میں تو اسے دیکھ کر کانپ کر رہ گیا۔اس پتھر کو ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چھوا تھا۔میں نے پتھر کو ہاتھ لگایا تو مجھے ہزاروں وولٹ کا کرنٹ لگا،سارے جسم میں ایک بجلی سی کوندگئی، میں اس کے سامنے سے ہٹا تو میرا بازو تھامنے والی لڑکی حجر اسود کے سامنے وہاں آ گئی، جہاں میں کھڑا تھا۔اس نے بھی جنت کے پتھر کو چھو لیا ہو گا۔

حجر اسود کو چھونے کے بعد ہم حطیم میں داخل ہو گئے۔خانہ کعبہ کے حجر اسود والے کونے کے بعد اگلے دو کونوں رکن عراقی اور رکن شامی کے گرد آدھے دائرے کی شکل میں بنی دیوار کے اندرونی حصے کو حطیم کہتے ہیں ۔یہ خانہ کعبہ ہی کا حصہ ہے اور یہاں پڑھی گئی نماز کا ثواب، خانہ کعبہ کے اندر پڑھی گئی نماز کے برابر ہے۔حطیم میں مرد اور عورت دونوں جا سکتے ہیں اور نماز پڑھ سکتے ہیں ۔عام طور پر یہاں رش ہوتا ہے لیکن ہمارے لیے کچھ ایسی آسانی پیدا ہوئی کہ ہم دونوں بہت سہولت کے ساتھ حطیم میں داخل ہو گئے اور نہایت سکون سے دو نفل ادا کیے۔اس کے بعد ہم دونوں ایک بار پھر کعبے کا طواف کرنے لگے۔ہم نے عقل مندی یہ کی کہ کعبے کے قریب رہ کر طواف کرتے رہے۔دوسرے چکر میں میں نے

کعبے کو چھولیا، شبنم بھی نم آنکھوں سے آگے بڑھی اور غلاف کو چومنے لگی۔ وہ انگلی سے غلافِ کعبہ پر ان سب کے نام لکھ رہی تھی جنھوں نے اس کی خاص فرمائش کی تھی، میں نے اپنے والدین، بہن بھائیوں اور ان کے بچوں کے علاوہ کچھ دوستوں کے نام لکھے۔ اپنا اور شبنم کا نام بھی لکھا اور سب سے آخر میں اپنے بچوں اجالا ناصر، احسن بشیر، جواد بشیر اور ارفع ناصر کے نام لکھے۔

غلاف کعبہ کی خوشبو عجیب خوشبو ہے، آپ ایک بار غلاف کو چھولیں یہ آپ کے ہاتھوں کو تادیر معطر رکھتی ہے، خوشبو کوئی بھی ہو میرے سر میں درد کر دیتی ہے۔ لیکن غلاف کعبہ کی خوشبو نے مجھے مسحور کر کے رکھ دیا۔ سات چکر پورے ہو گئے تو مقام ابراہیم پر دو نفل ادا کیے، کیونکہ طواف، مقام ابراہیم پر دو نفل ادا کر کے ہی مکمل ہوتا ہے۔

خانۂ کعبہ گُم ہو گیا!

مطاف سے نکل کر ہم حرم شریف کے اس حصے کی طرف چلے گئے جو ابھی تک ہم نے نہیں دیکھا تھا۔ یہ مسجد اتنی بڑی ہے کہ آپ چلتے چلتے تھک جائیں گے، مسجد کی عمارت ختم نہیں ہوگی، مطاف کے اندر جہاں زم زم کلاک ٹاور جھانکتا ہوا دکھائی دیتا ہے وہاں بڑی بڑی کرینیں بھی نظر آتی ہیں، جو اس مسجد کو مزید خوبصورت اور وسیع کرنے میں مصروف ہیں۔ طواف کرتے ہوئے دل میں خیال آتا ہے کہ کہیں یہ بھاری مشینری کسی کے سر پر نہ آ گرے۔

مسجد کے ایک حصے میں پہنچے تو مجھے ساجد فاروقی صاحب مل گئے۔ وہ میرے ساتھ گورنمنٹ دیال سنگھ کالج لاہور میں ملازمت کرتے ہیں۔ علم التعلیم کے استاد ہیں، وہ اپنی بیگم صاحبہ اور خوش دامن کے ہمراہ عمرہ کرنے آئے تھے، لاہور ایئر پورٹ پر تو ان سے

ملاقات نہیں ہو سکی لیکن یہاں وہ اچانک مل گئے تو خوش گوار حیرت ہوئی۔ ساجد نے بتایا کہ آج خانۂ کعبہ انھیں نہیں مل سکا۔ مسجد کی بھول بھلیوں میں گھوم پھر کر واپس ہوٹل جا رہے ہیں۔ مجھے ان کی بات سن کر بہت حیرت ہوئی، دیواروں پر مطاف کے راستے کے بارے میں جلی حروف میں لکھا ہوا ہے، ہر پڑھا لکھا آدمی آسانی سے خانۂ کعبہ تک پہنچ سکتا ہے۔ پھر میں نے سوچا ممکن ہے کہ خانۂ کعبہ نے جان بوجھ کر خود کو ساجد صاحب کی نظروں سے اوجھل کر لیا ہو۔ پھر سوچا کہ جب اللہ چاہے گا، ساجد بھی میری طرح خانۂ کعبہ کے در و دیوار کو چھو ہی لیں گے۔ ان کے ساتھ آئی ہوئی ایک عمر رسیدہ اوران پڑھ خاتون، ان سے بچھڑ گئی تھی اور اس کے تمام کاغذات ان کے پاس تھے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ پریشانی ساجد کا پیچھا کرتے کرتے حرم شریف تک کیوں آ گئی تھی؟

اس گم شدہ فیملی سے رخصت پا کر ہم آبِ زم زم سے بھرے کولروں کے پاس بیٹھ گئے۔ دونوں نے خوب پانی پیا۔ بوتلیں بھریں، میں نے اپنے سر پر زم زم لگایا تو ٹھنڈک سارے جسم میں اتر گئی۔ میرے والد محترم بشیر احمد راٹھور نے پاکستان سے خصوصی طور پر مجھے فون پر حکم دیا تھا کہ اپنے سر پر آبِ زم زم ہر روز لگانا۔ وہ جانتے ہیں کہ میرے آدھے سر میں درد ہوتا ہے اور کم از کم چار دن تک رہتا ہے، کسی دوا سے ٹھیک نہیں ہوتا، چار دن پورے ہوتے ہیں تو آپ ہی غائب ہو جاتا ہے۔

راہ نمائی کے لیے لگے بورڈ پڑھتے پڑھتے ہم ایک بار پھر باب ملک فہد کے پاس پہنچے۔ اپنے جوتے پہنے اور کبوتر چوک کی طرف چل دیے۔ ہمیں تو بتایا گیا تھا کہ وہاں کبھی کسی کا جوتا اسے واپس نہیں ملتا، کسی اور کا جوتا پہن کر واپس آنا پڑتا ہے لیکن ہمارے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ اگر آپ یاد رکھیں کہ جوتے کہاں رکھے تھے تو آپ کو وہیں ملیں گے۔ ہوتا یہ ہے کہ لوگ حرم شریف کے اندر داخل کسی اور دروازے سے ہوتے ہیں اور باہر کسی اور

دروازے سے نکلتے ہیں، دروازے سارے ایک جیسے ہیں لیکن ان سب کے نمبر الگ الگ ہیں۔ اگر آپ حرم میں داخل ہوتے ہوئے اپنے دروازے کا نمبر یاد رکھیں اور اسی دروازے سے واپس آئیں تو آپ کا جوتا کبھی گم نہیں ہوگا۔ ہم دونوں نے حرم شریف میں داخلے کے لیے دروازہ نمبر 88 اور 89 مخصوص کرلیا تھا اور دونوں دروازوں کے درمیان موجود خالی جگہ پر جوتے رکھ دیتے تھے۔ واپسی پر اُٹھا لیتے تھے۔

حرم شریف کے باہر بہت صاف ستھرے ریستوران ہیں، یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ یہاں سے گزریں اور کوئی چیز خرید کر نہ کھائیں۔ ہم چونکہ ناشتا کر چکے تھے، اس لیے دو ریال فی کپ کے حساب سے چائے کے دو کپ لیے اور وہیں فٹ پاتھ پر بیٹھ کر پینے لگے۔ حرم شریف کے اندر تو صفائی کا جو عالم ہے سو ہے اس کے باہر بھی دور دور تک صفائی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ زمین اتنی صاف ہوتی ہے کہ آپ وہاں نماز پڑھ سکتے ہیں، بیٹھ سکتے ہیں، سو سکتے ہیں۔ صفائی کا عملہ ہر وقت سرگرم رہتا ہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد عملہ صفائی کا انچارج آتا ہے اور اپنے موبائل سے علاقے کی تصاویر بناتا ہے اور اپنے محکمے کے اعلیٰ حکام کو بھیج دیتا ہے۔

گمشدہ جوتے کہاں جاتے ہیں؟

جب ہم فٹ پاتھ پر بیٹھے چائے پی رہے تھے تو سڑک پر ہمارے سامنے بہت سے جوتے بے ترتیبی سے پڑے ہوئے تھے، یہ حرم کا بیرونی علاقہ تھا، اس لیے صفائی کا عملہ یہاں پڑے جوتے بڑے بڑے کنٹینروں میں ڈال کر لے جاتا ہے۔ یہ منظر میں نے کئی بار دیکھا، ہمارے چائے پیتے پیتے بھی صفائی کا عملہ آیا اور سڑک پر پڑے سارے جوتے جمع کر کے کنٹینر میں ڈالنے لگا۔ شبنم نے ایک اہل کار سے پوچھا کہ ان جوتوں کا آپ کیا کریں

گے تو اس نے جواب دیا کہ یہ کچرے میں پھینک دیے جائیں گے اور وہاں سے جس کا جی چاہے اٹھا کر لے جائے۔ صفائی کا عملہ حرم شریف کے اندر پڑے جوتے کبھی نہیں اٹھاتا۔ اس لیے ہر حاجی کو چاہیے کہ اپنے جوتے شاپنگ بیگ میں ڈال کر جوتوں کے لیے مخصوص جگہ پر رکھے۔ میں ہر حاجی کو مشورہ دوں گا کہ اپنے ساتھ ہر وقت دو چار شاپنگ بیگ اور دو خالی بوتلیں ضرور اپنے ساتھ رکھے۔ یہ چیزیں جگہ جگہ آپ کے کام آتی ہیں۔

چائے پینے کے بعد ہم کبوتر چوک پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ جہاں صبح ہزاروں جنگلی کبوتر تھے، اب وہاں ایک بھی کبوتر نہیں تھا، حتیٰ کہ کبوتروں کے لیے ڈالی گئی گندم، باجرے اور جو کا ایک دانہ بھی وہاں نہ تھا۔ ایک مخصوص وقت کے بعد صفائی کا عملہ آتا ہے اور سارا دانہ اٹھا کر لے جاتا ہے، کبوتر خود بخود غائب ہو جاتے ہیں۔ تقریباً گیارہ بجے ہم ونڈو شاپنگ کرتے ہوئے اپنے ہوٹل کے کمرے میں پہنچ گئے، جہاں بابا بشیر اپنی مختصر فیملی کے ساتھ گھوڑے بیچ کر سوئے ہوئے تھے۔

تیری تقسیم کا انداز عجب ہے مولا!

اللہ کی تقسیم!

ہمارے پہنچنے پر بابا جی اوران کی فیملی جاگ گئی۔اب ہم سونا چاہتے تھے اور بابا جی اپنی فیملی کے ساتھ باہر جانا چاہتے تھے۔ہم دونوں بہت زیادہ پیدل چل چل کر اگرچہ تھک چکے تھے لیکن تھکاوٹ کا احساس نام کو بھی نہ تھا۔جسم کو آرام دینے کے لیے بستر پر دراز ہوئے تو فوراً نیند آ گئی۔آنکھ کھلی تو شام کے چار بج رہے تھے۔دل آپ ہی آپ کہہ رہا تھا کہ اٹھو اور کعبے کی طرف چلو۔شبنم نے کہا کہ ہم مکے کے اس ٹھنڈے اور آرام دہ کمرے میں آرام کرنے نہیں آئے۔میں نے پوچھا: ''کہاں چلیں؟'' بولی: ''خانہ کعبہ اور کہاں؟'' ملا کی دوڑ مسجد تک۔یہ کہاوت اب سمجھ میں آئی۔میں خانہ کعبہ کو دن کے ہر پہر میں دیکھنے کا آرزو

مند تھا۔چنانچہ ہم دونوں ایک بار پھر نہا دھو کر تیار ہوئے اور شارع ابراہیم خلیل پر پیدل چل پڑے۔

کبوتر چوک میں پہنچے تو چوک موجود تھا، کبوتر غائب تھے۔ہم دونوں نے حرم شریف کے باہر ادھر ادھر گھومنا شروع کر دیا۔اپنے سوا وہاں مجھے کوئی گداگر دکھائی نہیں دیا، میری نیت اس وقت گداگروں والی ہی تھی۔میں نے شبنم سے کہا: ''لوگ تو کہتے تھے کہ حرم شریف کے ارد گرد ہر وقت کچھ نہ کچھ تقسیم ہوتا رہتا ہے، یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔''

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا اور وہ کوئی جواب بھی دینے نہ پائی تھی کہ اس نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''وہ دیکھیں!'' میں نے دیکھا تو کوئی صاحب کھجوروں سے بھرا ٹوکرا رکھ گئے تھے اور لوگ آپ ہی آپ اس میں پڑی کھجوریں اٹھا رہے تھے۔لینے والے ہاتھ موجود تھے، دینے والا ہاتھ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔میں سمجھ گیا کہ یہ میرے گلے کا جواب آیا ہے۔ ہم دونوں اس ٹوکرے کی طرف بڑھے۔شبنم نے اپنا دوپٹا پھیلا لیا اور میں اس ٹوکرے میں سے کھجوریں اٹھا اٹھا کر اس کے دوپٹے میں ڈالنے لگا۔مجھے کسی نے منع نہیں کیا، کسی نے نہیں ٹوکا۔جتنی کھجوریں میں چاہتا تھا، اتنی اٹھائیں۔اللہ کا یہ میٹھا تحفہ کھایا تو میرے دل نے کہا: ''یہی جنت کا پھل ہے۔'' اتنی میٹھی کھجوریں میں نے پہلے کبھی نہیں کھائی تھیں۔میں نے فوراً توبہ کی۔اپنا گلہ واپس لے لیا۔جہاں کھجوروں کا ٹوکرا پڑا تھا وہاں ایک قطار میں مجھے کھانے پینے کی کئی دکانیں دکھائی دیں۔لوگ قطار میں لگ کر وہاں سے جوس، شوارمے اور برگر لیتے اور ایک طرف جا کر کھانے پینے میں مشغول ہو جاتے۔یہ سب مفت میں مل رہا تھا۔پتا چلا کہ کچھ لوگ دکان داروں کو رقم دے دیتے ہیں اور یہ نہایت ایمان داری سے اتنی رقم کے جوس، شوارمے اور برگر وہاں موجود لوگوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔اتنی اچھی تقسیم میں نے کہیں نہیں دیکھی۔دھینگا مشتی ہے نہ نا انصافی۔سب کو ایک جیسی چیز کھانے کو

مل رہی ہے۔ تقسیم کرنے والا چھپ چھپا کر بیٹھا ہے اور بغیر کسی کو دکھائی دیے، فیض یاب ہونے والوں کی دعائیں سمیٹ رہا ہے۔ مجھے اپنی ایک حمد کا مطلع یاد آ گیا۔

تیری تقسیم کا انداز عجب ہے مولا!
وہ بھی پاتا ہے جو بے نام و نسب ہے مولا!

اللہ کی تقسیم ازل سے نا انصافی سے پاک ہے۔ سورج کی روشنی امیر غریب، پاک باز، گناہ گار اور مسلم غیر مسلم سب تک پہنچتی ہے۔ ہوا اور پانی سب کے لیے ہے۔ پرندوں کے نغمے سب کے دلوں کو لبھاتے ہیں۔ پھول کانٹوں کو بھی میسر آتے ہیں۔ رزق سب تک پہنچتا ہے۔ یہ تو ہم انسان ہیں جو اللہ کی بنائی ہوئی چیزوں پر اپنا اپنا قبضہ جماتے ہیں اور اپنا حق ملکیت جتا کر بہت سوں کو ان سے محروم کر دیتے ہیں۔ جہاں انسان دخل اندازی کرتا ہے، وہاں کہیں نہ کہیں انصاف کی موت ہو ہی جاتی ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی چیزیں انسان کو مفت میں مل جاتی ہیں۔ ان کے لیے اسے جدوجہد نہیں کرنا پڑتی۔ اصولِ فطرت تو یہی ہے لیکن اب اللہ کی بنائی ہوئی چیزوں کے لیے بھی انسان لڑتے ہیں، ایک دوسرے کو مارتے ہیں اور قتل کرتے ہیں۔

انڈینز کا پاکستانی ہوٹل

شام ہوئی تو ہم نے ایک پاکستانی ہوٹل تلاش کیا اور کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ ہوٹل کے باہر جلی حروف میں لکھا تھا ''پاکستانی کھانوں کا مرکز'' لیکن وہاں موجود عملہ دیکھ کر مجھے شبہ ہوا کہ یہ پاکستانی نہیں۔ میں نے ویٹر کو اپنے پاس بلایا اور بولا: ''بیٹا میں دہلی کا ہوں (شبنم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا) اور یہ کان پور کی ہے۔ اسے سپاری کھانے کی عادت ہے، کیا یہاں سپاری کہیں سے مل جائے گی؟'' وہ بولا: ''ملتی تو نہیں لیکن ہمارے کچھ لوگ ایک

دوسرے کے لیے انڈیا سے لاتے ہیں۔ میں خود بھی سپاری کھاتا ہوں، یہ لیجیے۔'' اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سپاری کی چھوٹی سی تھیلی شبنم کے حوالے کر دی۔ پھر میں نے اس سے پوچھا: ''تم کہاں کے ہو؟'' بولا: ''میں انڈین ہوں'' میں اس کے اس انکشاف پر بہت حیران ہوا۔ میری حیرت کو بھانپتے ہوئے وہ مزید بولا: ''مکے میں جتنے بھی پاکستانی ہوٹل ہیں، ان سب میں زیادہ اسٹاف انڈین یا بنگلہ دیشی ہے۔ ہوٹل کو ہم پاکستانی شناخت نہ دیں تو پاکستانی حاجی شاید ہمارے ہوٹلوں پر کھانا کھانے نہ آئیں۔''

ہم نے حسبِ معمول ایک سالن کا آرڈر دیا۔ تین روٹیاں مفت میں ساتھ ملیں۔ ایک آدمی کا کھانا دو آدمیوں کے لیے کافی ہوتا ہے۔ الگ الگ کھانا منگوایا جائے تو کھانا بھی ضائع ہوتا ہے اور پیسے بھی۔ تین ریال میں کولڈ ڈرنک کے دو ٹین پیک مل جاتے ہیں۔ ہم کھانے کے ساتھ کبھی کبھی ٹین پیک لے لیتے۔ عام طور پر ہمارے پاس آبِ زم زم سے بھری بوتل ہوتی تھی۔ خود بھی پیتے اور کھانے کی میز پر موجود دوسرے لوگوں کو بھی پلاتے۔

مکے کے ہوٹلوں میں کھانے کے معیار پر کوئی سمجھوتا نہیں کیا جاتا۔ حکام روز کے روز تقریباً ہر ہوٹل کا کھانا اور کچن چیک کرتے ہیں۔ نرخ نامہ ہر ہوٹل میں عین اس مقام پر لگایا جاتا ہے جہاں ہر گاہک کی نظر پڑتی ہے۔ بل ادا کرتے وقت آپ کو بحث نہیں کرنا پڑتی۔ جو نرخ درج ہوتے ہیں، وہی ادا کریں اور چلے جائیں۔ نماز کے وقت دوسری دکانوں کی طرح یہ ہوٹل بھی بند ہو جاتے ہیں۔

کھانا کھا کر ہم مکے کی گلیوں میں نکل گئے۔ مکہ چونکہ پہاڑوں میں واقع ہے، اس لیے اس کی گلیاں اوپر کی طرف جاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ چلتے ہوئے خوب طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان گلیوں میں پہاڑوں کے کناروں پر بنے چھوٹے چھوٹے مکان آنکھوں کو بہت بھلے لگتے ہیں۔ ان گلیوں میں ہمیں مکے کے اصل باشندے دکھائی

دیے۔عمرے کے لیے آئے ہوئے لوگ ان گلیوں میں کم ہی آتے ہیں۔ بچے کھیلتے نظر آئے۔بچوں کو میں نے وہاں جگہ جگہ فٹ بال کھیلتے دیکھا۔شاید یہ وہاں کے لوگوں کا پسندیدہ کھیل ہے۔

اپنے ہوٹل میں واپس آئے تو خلافِ معمول ہم جلدی سو گئے۔

سچا خواب

رات کو چونکہ ہم جلدی سو گئے تھے،اس لیے فجر کے وقت ہماری آنکھ کھل گئی۔بابا بشیر اور ان کی فیملی ہم سے پہلے نماز کے لیے جا چکی تھی۔ہم ہوٹل سے نکلے تو باہر بالکل وہی سماں تھا جو ہمیں پہلی رات عمرے کے لیے جاتے ہوئے دکھائی دیا تھا۔لوگ قافلوں کی صورت میں حرم شریف کی طرف رواں دواں تھے۔ دکانیں کچھ کھلی تھیں کچھ بند۔فٹ پاتھوں پر کچھ لوگ بیٹھے چیزیں بیچ رہے تھے۔ابھی اذان ہونے میں کافی وقت تھا،اس لیے ہم دونوں فٹ پاتھ پر پڑے سامان کو رک رک کر دیکھنے لگے۔یہ سامان دکانوں کی نسبت ذرا سستا تھا۔ہم نے کچھ سامان خریدا اور اپنے شاپنگ بیگ میں ڈال لیا۔حرم شریف پہنچے تو اذان ہونے لگی۔لوگوں کو جہاں جگہ ملی،وہیں نماز کی نیت باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ہم تیزی سے چلتے ہوئے خانہ کعبہ کے قریب پہنچ گئے۔ہم دونوں اوپری مطاف پر چلے گئے اور فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد ایک بار پھر طواف کرنے لگے۔حرم شریف سے باہر آئے ہوئے کئی لوگوں کو دیکھا جو وہاں موجود لوگوں میں کھجوریں تقسیم کر رہے تھے۔ہم نے بھی اپنا حصہ لیا۔یہاں بھی مجھے اللہ کی تقسیم نظر آئی۔ہزاروں لوگ موجود ہیں۔کھجوریں تھوڑی ہیں اس کے باوجود کوئی ہڑبونگ نہیں۔ہم نے آبِ زم زم پیا،خالی بوتلیں بھریں اور اپنے جوتے اٹھا کر باہر آ گئے۔کبوتر چوک پہنچے تو وہ ایک بار پھر کبوتر چوک بن چکا تھا۔کبوتر ہی کبوتر دکھائی دے

رہے تھے۔لوگ ان کے ساتھ تصویریں بنوا رہے تھے۔انڈین لوگوں کے پاکستانی ہوٹل سے ناشتا کیا اور ایک بار پھر فندق المسارات المملکۃ یعنی اپنے ہوٹل میں آ گئے۔

بابا جی کی فیملی بھی موجود تھی۔بابا بشیر چپ چاپ بیٹھے تھے،ان کی بیگم صاحبہ کسی بات پر خفا ہو رہی تھیں۔ جب میں نے پوچھا تو اماں پنجابی میں بولیں: ''باتھ روم کی دونوں ٹونٹیوں سے گرم پانی آ رہا ہے۔اس سے چائے تو بن سکتی ہے،وضو نہیں ہو سکتا۔''ان کی یہ بات سن کر ہم سب ہنس پڑے۔اماں جی چٹی ان پڑھ لگتی تھیں لیکن ان کا جملہ تخلیقی تھا۔اماں جی کو اس بات پر بھی غصہ تھا کہ کل وہ مسجد عائشہ گئیں تو وہاں سے کسی نے ان کا نیا سوٹ اٹھا لیا۔مسجد عائشہ کو میقات کا درجہ حاصل ہے۔ مکے میں یہ قریب ترین میقات ہے۔اماں جی کو کسی کے نام کا عمرہ کرنا تھا اس لیے وہ بابا جی اور اپنی بیٹی شازیہ کے ساتھ وہاں گئی تھیں۔

اس چوری پر میں خود حیران تھا۔میں نے سنا تھا کہ سعودی عرب میں چوری بہت کم ہوتی ہے کیونکہ وہاں سزا فوراً سنا دی جاتی ہے۔سزا بھی وہ دی جاتی ہے جو آپ کو دوبارہ چوری کرنے کے قابل ہی نہیں چھوڑتی۔آج اماں جی نے احتجاجاً سارا دن ہوٹل میں گزارنے کا فیصلہ کیا تھا۔وہ سب سے ناراض تھیں۔

اگلے روز ہمیں صبح سویرے مدینہ منورہ روانہ ہونا تھا اس لیے دل چاہتا تھا کہ آج کا دن اور آج کی رات پلک جھپکنے میں گزر جائے لیکن وقت تو وقت ہے۔اپنی رفتار سے چلتا ہے۔اسے دوسروں کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔دوسروں کو اس کی پروا کرنا پڑتی ہے اور جو لوگ وقت کی پروا نہیں کرتے،وقت ان کی پروا نہیں کرتا۔بابا جی کی فیملی کو بھی چونکہ ہمارے ساتھ ہی مدینہ منورہ روانہ ہونا تھا چنانچہ ہم سب نے متفقہ فیصلہ کیا کہ اب سو جاتے ہیں اور شام کو جاگنے کے بعد اکٹھے خانہ کعبہ جائیں گے اور عشا کی نماز کے بعد واپس آ کر سو جائیں گے۔

سو ہم سب نے اپنے اس پروگرام پر پورا پورا عمل کیا۔

رات کو میں بستر پر دراز ہوا تو خواب ہی خواب میں مدینے جا پہنچا۔ میرا خواب آنکھ کھلنے پر سچ ثابت ہونے والا تھا۔

مدینے کے سفر پر میں روانہ ہو رہا ہوں

مدینے کا سفر ہے

آنکھ کھلی تو بابا بشیر کی فیملی اپنے بستروں پر نہیں تھی۔ وہ سب شاید خانہ کعبہ کی طرف نکل گئے تھے۔ ہم دونوں بھی جلدی سے تیار ہوئے اور ہر روز کی طرح شارع ابراہیم خلیل سے ہوتے ہوئے حرم شریف پہنچ گئے۔ نمازِ فجر ادا کی۔ خانہ کعبہ کا طواف کیا۔ خوب آبِ زم زم پیا۔ بوتلوں میں بھرا اور ہوٹل کی طرف چل پڑے۔

ہوٹل کی انتظامیہ نے بتایا تھا کہ مدینے جانے والی بس صبح چھ بجے آ جائے گی۔ جو لوگ وقت پر آ جائیں گے انھیں مدینے لے جائے گی اور جو رہ جائیں گے، اپنے خرچ پر مدینے جائیں گے۔ مجھے یقین تھا کہ بس ایک آدھ گھنٹا لیٹ ہو گی اس لیے ہم دونوں ناشتا کرنے

کے لیے اپنے پسندیدہ پاکستانی ہوٹل میں بیٹھ گئے۔ ناشتہ کر کے اپنے ہوٹل 'المسارات'' پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ مدینے جانے والی بس بالکل تیار کھڑی تھی۔ تمام لوگ اپنی نشستیں سنبھال چکے تھے۔ صرف ہمارا انتظار تھا بس کھٹارا سی تھی لیکن مجھے اس لیے اچھی لگی کہ یہ مدینے جا رہی تھی۔ ہم نے جلدی جلدی اپنا سامان بس میں رکھوایا۔ بابا بشیر اور ان کی فیملی پہلے ہی بس میں موجود تھی۔ شبنم کو ان کے ساتھ جگہ مل گئی۔ مجھے سب سے پچھلی نشست ملی۔ بس کی پچھلی نشست مجھے اچھی نہیں لگتی۔ پیچھے مڑ کر دیکھو تو بہت کچھ چھوڑنے کا گمان ہوتا ہے۔ جدائی کا دکھ مزید گہرا ہو جاتا ہے۔ اس لیے ہمیشہ کوشش کرتا ہوں کہ بس کی اگلی نشست پر بیٹھوں۔ اگلی نشست پر بیٹھ کر نئی منزلیں اور نئے راستے دکھائی دیتے ہیں۔ شوقِ ملاقات فزوں تر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میں ڈرائیور کے پاس گیا۔ وہ نیچے کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس سے ''اظہارِ یک جہتی'' کے لیے میں نے بھی ایک سگریٹ نکالا اور کش لگانے لگا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ ہماری فریکوئنسی مل گئی ہے تو میں نے اسے مخاطب کیا اور بولا: ''میں آپ کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ جاؤں؟'' میرا خیال تھا کہ میرے تاخیر سے آنے پر وہ غصے میں ہو گا لیکن اس نے بہت خوش دلی سے کہا: ''یہ نشست ایک اور حاجی صاحب کی ہے۔ آپ کو فرنٹ پر بیٹھنے کا شوق ہے تو میرے ساتھ پڑی خالی جگہ پر بیٹھ جایئے گا''۔ اس کا لہجہ پوٹھوہاری تھا۔ میں جان گیا تھا کہ اس کا تعلق راولپنڈی ڈویژن سے ہے۔ جب میں نے اس سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس کا تعلق پنڈی گھیپ سے ہے اور پچھلے دس برسوں سے سعودی عرب میں مقیم ہے۔ وہ میرے شوقِ سفر کو بھانپ گیا تھا۔ شاید میرے دل کی کیفیات کو بھی جان گیا تھا اس لیے اس نے اپنی نشست پر بیٹھنے سے پہلے مجھے اپنے ساتھ فرش پر بٹھا لیا۔ بس مدینے کی طرف چل پڑی۔ یہ فرشی نشست بہت شاندار تھی۔ اس کی اُونچائی بھی اچھی خاصی تھی۔ بس کی ونڈسکرین میرے سامنے تھی۔ سامنے کا سارا نظارہ فلم کے پردے کی

طرح مجھے مسحور کر رہا تھا۔ مکہ شہر سے گزرتے ہوئے بڑے بڑے پہاڑوں پر بنے مکان بہت پرشکوہ دکھائی دے رہے تھے۔ چھوٹی بڑی کاریں پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر پارک تھیں۔ دیکھ کر یوں لگ رہا تھا کہ ابھی ہوا کا ایک جھونکا آئے گا اور انھیں نیچے لڑھکا دے گا۔ سڑک کے کناروں پر جگہ جگہ بڑی سکرینیں لگی ہوئی تھیں جن پر طواف کا منظر براہ راست دکھایا جا رہا تھا۔ بس شہر سے باہر نکلی تو اردگرد بڑے بڑے پہاڑ دکھائی دینے لگے۔ سبزے کا دور دور تک کوئی نشان نہ تھا۔ ہر طرف ریت اور مٹی دکھائی دے رہی تھی۔ اب کہیں کہیں پٹرول پمپ بھی دکھائی دینے لگے تھے۔ کسی پمپ پر میں نے گاڑیوں کی قطاریں نہیں دیکھیں۔ میں مبہوت ہو کر بس کی ونڈ سکرین سے نظر آنے والے منظر دیکھ رہا تھا۔ میرا انہماک دیکھ کر ڈرائیور بولا: ”حاجی صاحب! ایک بات پوچھوں آپ سے؟“ میں نے اثبات میں جواب دیا تو بولا: ”اگر میں کہتا کہ اس بس میں کوئی نشست نہیں ہے تو کیا میرے کہنے پر بھی آپ اس فرشی نشست پر خوشی خوشی بیٹھ جاتے؟“

میں نے کہا: ”بالکل بیٹھ جاتا“۔ تب وہ بولا: ”میں ہر روز حاجیوں کو مکے سے مدینے لے کر جاتا ہوں اور مدینے سے مکے لاتا ہوں۔ کئی لوگ مجھ سے صرف اس بات پر لڑتے ہیں کہ انھیں ان کی مرضی کی نشست نہیں ملی“۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا بس کی پچھلی نشستوں سے ایک صاحب اٹھ کر آئے اور مجھے مخاطب کر کے بولے: ”بھائی صاحب! پچھلی نشستوں پر بہت گرمی ہے۔ بس کا اے سی ذرا تیز کر دیں“۔ ان صاحب کے لہجے میں غصہ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ مجھے شاید بس کا کنڈکٹر سمجھ رہے تھے۔

اس سے پہلے کہ ڈرائیور کچھ کہتا میں بولا: ”جناب! آپ کے علم میں ہے کہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟ آپ مکے سے مدینے جا رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے نبی ﷺ نے

مکے سے مدینے کی طرف کن حالات میں کس طرح سفر کیا تھا؟ تب ایسی اے سی والی بسیں تو نہیں تھیں۔ یہ سفر آپ سنت سمجھ کر کریں تو آپ کی ساری مشکلات آسان ہو جائیں گی“۔

میری بات سن کر وہ صاحب ٹھنڈے ہو گئے اور چپ چاپ اپنی نشست پر جا بیٹھے۔

میری بات اگلی نشستوں پر بیٹھے کئی حاجیوں نے سن لی تھی۔ میری دلیل پر کئی لوگ زیر لب مسکرا دیے تھے۔ ڈرائیور الگ خوش تھا کہ میں نے اسے ایک مشکل سے بچا لیا تھا۔

اور میں نم دیدہ نم دیدہ

جس سڑک پر بس دوڑی جا رہی تھی، یہ دو رویہ تھی۔ مکے سے مدینہ تقریباً پونے چار سو کلومیٹر دور ہے۔ بس کی رفتار بتا رہی تھی کہ ہم تقریباً ساڑھے چار گھنٹے کی مسافت طے کر کے مدینے پہنچیں گے۔

بس کے مدینے کی طرف جاتے ہوئے مجھے نابینا شاعر پروفیسر اقبال عظیم کی مشہور نعت یاد آ رہی تھی۔

مدینے کا سفر ہے اور میں نم دیدہ دیدہ
جبیں افسردہ افسردہ، قدم لغزیدہ لغزیدہ

....

چلا ہوں ایک مجرم کی طرح میں جانبِ طیبہ
نظر شرمندہ شرمندہ، بدن لرزیدہ لرزیدہ

....

کسی کے ہاتھ نے مجھ کو سہارا دے دیا ورنہ
کہاں میں اور کہاں یہ راستے پیچیدہ پیچیدہ

....

غلامانِ محمدؐ دور سے پہچانے جاتے ہیں

دلِ گرویدہ گرویدہ، سرِ شوریدہ شوریدہ

....

کہاں میں اور کہاں اس روضۂ اقدس کا نظارہ
نظر اس سمت اٹھتی ہے مگر دزدیدہ دزدیدہ

....

بصارت کھو گئی لیکن بصیرت تو سلامت ہے
مدینہ ہم نے دیکھا ہے مگر نادیدہ نادیدہ

....

وہی اقبال جس کو ناز تھا کل خوش مزاجی پر
فراقِ طیبہ میں رہتا ہے اب رنجیدہ رنجیدہ

....

میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اونچی آواز میں یہ نعت پڑھوں۔ اگر میں اس بس کا ڈرائیور ہوتا تو مکے سے مدینے کی طرف جاتے ہوئے اس نعت کی کیسٹ یا سی ڈی اپنے ساتھ رکھتا اور سارے راستے یہی نعت چلتی رہتی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ سعودی عرب میں پبلک ٹرانسپورٹ میں کیسٹ یا سی ڈی چلانے کی ممانعت ہے۔ ہو ممانعت، مجھے کیا؟ آپ دیکھیے لفظ ممانعت میں نعت کا لفظ بھی شامل ہے۔ نعت کا سفر کوئی نہیں روک سکتا۔

تقریباً تین گھنٹے کی مسافت کے بعد ڈرائیور نے بس ایک ڈھابے کے قریب روک دی۔ یہ ایک عام سا ڈھابا تھا۔ لوگ زمین پر بچھی چاندنیوں پر چوکڑی مارے بیٹھے تھے۔ کوئی کھانا کھا رہا تھا، کوئی چائے پی رہا تھا۔ پلاؤ بھی تھا اور روٹی سالن بھی۔ پلاؤ کی ایک پلیٹ اتنی بڑی تھی کہ دو تین آدمی آسانی سے پیٹ بھر کر کھا سکتے تھے۔ لطف کی بات یہ کہ کھانے، چائے اور کولڈ ڈرنک کے یہاں وہی نرخ تھے جو مکے میں تھے۔

مسجدِ نبویؐ کے مینار نظر آئے

تقریباً بیس منٹ کے بعد بس دوبارہ چل پڑی۔ ایک گھنٹے کے بعد ہم مدینے کی حدود میں داخل ہو گئے۔ تھوڑا سا اور آگے گئے تو ڈرائیور نے مجھے اس پچھلی نشست پر بیٹھنے کو کہا جو آغازِ سفر میں مجھے ملی تھی۔ میں نے وجہ پوچھی تو بولا: ”آگے پولیس چیک پوسٹ آ رہی ہے۔ پولیس نے آپ کو فرشی نشست پر بیٹھے دیکھ لیا تو آپ کا بھی چالان ہو جائے گا اور میرا بھی“۔ مجبوراً میں اپنی نشست پر آ بیٹھا۔ مدینے کو دیکھنے کی آرزو میری طرح شبنم کے دل میں تھی اس نے بس کی کھڑکی کا پردہ اٹھا رکھا تھا اور مسلسل باہر دیکھ رہی تھی اسے پتا ہی نہ چلا کہ میں کب اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے اسے چھوا تو اسے میری موجودگی کی خبر ہوئی۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو کچھ کچھ سبزہ دکھائی دینے لگا۔ چھوٹی چھوٹی آبادیاں بھی نظر آئیں۔ پولیس کی چیک پوسٹ گزر گئی تو ڈرائیور نے مجھے ایک بار پھر اپنے پاس بلوا لیا۔

بولا: ”حاجی صاحب، یہ مائیک لے لیں۔ اس کو آن کر کے تمام حاجیوں سے کہ دیں کہ اپنے اپنے ہوٹل کے واؤچر نکال لیں“۔ میں نے تعمیل کی۔ اب میں خود کو واقعی اس بس کا کنڈکٹر سمجھ رہا تھا۔

پھر ڈرائیور نے ایک کاغذ اور بال پوائنٹ مجھے دیا اور کہا کہ تمام حاجیوں کے واؤچر دیکھ کر اس کاغذ پر ان ہوٹلوں کے نام لکھ لوں، جہاں انھیں ٹھہرنا ہے۔ یہ تو بس کنڈکٹری ہے۔ مدینے کی تو مجھے گدائی بھی قبول ہے۔

میری نعت کا ایک شعر ہے:

ہاتھ میں کاسہ مرے جسم پہ جبہ ہوتا
آپ کے شہر میں ہوتا تو میں کیسا ہوتا

میں ایک ایک مسافر کے پاس گیا ایک ایک واؤچر دیکھا اور ہوٹلوں کے نام کاغذ پر لکھتا گیا۔ یہ چار یا پانچ ہوٹل بنتے تھے۔ میں نے وہ کاغذ ڈرائیور کو تھما دیا۔ اس کی ذمہ داری تھی کہ ہر مسافر کو اس کے ہوٹل تک اتار کر آئے۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ سب لوگ درود پاک پڑھنے لگے ہیں۔ کوئی بلند آواز میں پڑھ رہا تھا کوئی دھیمی آواز میں۔

میرا دل بھی ان کا ہم نوا ہو گیا۔

اتنے میں ایک آواز آئی ''اللہ اکبر''! میں نے چونک کر باہر کی طرف دیکھا تو روضۂ رسول ؐ کا سبز گنبد اپنا جلوہ دکھا رہا تھا۔ مسجدِ نبویؐ کے مینار بھی دکھائی دے رہے تھے۔ مجھے محمد علی ظہوری مرحوم کی یہ نعت یاد آ گئی:

جب مسجدِ نبویؐ کے مینار نظر آئے
اللہ کی رحمت کے آثار نظر آئے

مکینِ گنبدِ خضرا! میں آ گیا دیکھیں

نالائق طالب علم

چند لمحوں کے بعد ڈرائیور نے بس ایک ہوٹل کے سامنے روک دی۔ مَیں نے ہوٹل کا نام پڑھا تو یہ میرا ہوٹل نہیں تھا لیکن ڈرائیور نے اپنا اختیار استعمال کرتے ہوئے مجھے بھی اترنے کو کہا۔ چنانچہ ہم دونوں جلدی سے نیچے اترے۔ اپنا سامان نکلوایا اور سڑک پر رکھ دیا۔ بس کے زیادہ مسافروں کو یہیں اتارا گیا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے ہم سب مہاجرینِ مکہ ہیں اور اہلِ مدینہ ابھی آئیں گے اور ہمیں پچکارتے ہوئے اپنے ساتھ اپنے گھروں میں لے جائیں گے۔ ہوٹل کے کاؤنٹر پر ہم جیسے ''مہاجرینِ مکہ'' کا ہجوم تھا۔ ایک نوجوان جو ملتانی لہجے میں اردو بول رہا تھا۔ ہر ایک سے اس کا واؤچر لیتا اور اسے اس کے کمرے کی چابی تھما دیتا یا اسے کمرہ نمبر بتا دیتا۔ یہاں ایک ایک کمرے میں سات سات آٹھ آٹھ لوگ

ٹھہرائے جا رہے تھے۔ میں نے بابا بشیر سے ان کا ہوٹل واؤچر لے لیا اور اس نوجوان کے حوالے کر دیا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میرا تعلق ملتان سے ہے تو اس نے شہرنوازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمیں ایک ہی کمرے میں ٹھہرانے کا مژدہ سنا دیا۔ البتہ ہمارے کمرے میں چونکہ سات بستر تھے اس لیے اس نے ایک نئے جوڑے کو بھی ہمارے کمرے میں بھیج دیا۔ چابی چونکہ میرے پاس تھی اس لیے میں نے کمرہ کھولا اور خودغرضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی پسند کے دو بستروں پر قبضہ جما لیا۔ جب سب لوگ اپنا اپنا سامان رکھ چکے تو سب کچھ دیر آرام کے لیے بیٹھ گئے۔ اب ہمارے درمیان دو نئے لوگ بھی تھے اس لیے میں نے سب سے درخواست کی کہ پہلے ایک دوسرے سے متعارف ہو جائیں۔ چنانچہ سب نے اپنا اپنا تعارف کرایا۔ یہ تعلیم بالغاں سکول کا منظر تھا۔ سب لوگ باری باری اپنا تعارف کراتے گئے۔ نئے جوڑے نے تعارف کرایا تو پتا چلا کہ یہ اکرام الٰہی صاحب ہیں۔ تیس برس لاہور کی اعظم کلاتھ مارکیٹ میں کپڑے کا کاروبار کرتے رہے ہیں اور اب اپنی پوری فیملی کے ساتھ اپنے ننھیالی، ددھیالی، سسرالی اور آبائی شہر چنیوٹ میں رہتے ہیں۔ سبھی حیران تھے کہ تیس سال لاہور میں گزارنے کے باوجود ایک چھوٹے سے شہر میں دوبارہ کیسے جا بسے؟ اکرام الٰہی صاحب نے یہ بتا کر مزید حیران کر دیا کہ چنیوٹ میں وہ کپڑے کا نہیں، چاول کا کاروبار کر رہے ہیں۔ تعارفی لمحات کے دوران میں شبنم نے چائے بنائی تھی سب نے مل کر چائے پی۔ چائے کا سامان پاکستان سے ساتھ لے جانے کا فائدہ یہ ہُوا کہ مجھے طلب کے وقت چائے مل جاتی تھی۔ چائے کے دور کے بعد سب لوگ باری باری نہائے۔ لباس تبدیل کیا۔ سب سے پہلے اکرام صاحب اپنی بیگم نگینہ کے ساتھ مسجدِ نبوی ﷺ چلے گئے۔ ان کے بعد بابا بشیر کی فیملی نکلی۔ میں نے مسجدِ نبوی ﷺ جانے کے لیے سبز رنگ کا کوٹ پتلون اپنے سامان میں خاص طور پر رکھا تھا۔ میں مکین گنبدِ خضرا کے روبرو، اسی سبز رنگ کے

کوٹ پتلون میں ملبوس ہو کر جانا چاہتا تھا۔ شبنم سے استری کرا کے پہنا اور کمرے میں لگے قدِ آدم آئینے کے روبرو کھڑا ہو گیا۔ میں بار بار خود کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ میں اس صاحب الجمال ﷺ کے روبرو جانے کے لائق بھی ہوں یا نہیں؟ میرا اندر میلا تھا لیکن چاہتا تھا کہ کم از کم باہر سے تو اجلا نظر آؤں۔ دراصل یہ میرے اندر کے میل کچیل کی صفائی کا نقطۂ آغاز تھا۔ جرابیں میرے پاس پرانی تھیں۔ چنانچہ مَیں نے بوٹ بغیر جراب کے پہن لیے۔ شبنم نے دیکھا تو وہ خاصی حیران ہوئی۔ مَیں نے آج سے پہلے جرابوں کے بغیر بوٹ کبھی نہیں پہنے تھے۔

ہم دونوں مسجدِ نبوی ﷺ کی طرف چلے تو راستے میں ایک دکان دکھائی دی جہاں جرابوں کے نئے جوڑے بک رہے تھے۔ اگرچہ مہنگے تھے لیکن میں نے ایک پیکٹ خریدا جس میں تین جوڑے تھے۔ وہیں کھڑے کھڑے بوٹ اتار کر جرابوں کا نیا جوڑا پہنا۔ اب میں دربارِ محمدی ﷺ میں حاضری کے لیے تیار تھا۔ مَیں نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو مسجدِ نبوی ﷺ کی طرف جانے والے زیادہ لوگ چپل پہنے دکھائی دیے۔ جب مَیں نے شبنم سے اس کا ذکر کیا تو بولی: ''وہاں مہنگے جوتے گم ہو جاتے ہیں۔ شاید چوری بھی ہو جاتے ہوں''۔ مَیں نے کہا: ''مسجدِ نبوی ﷺ میں کسی کی کوئی چیز گم ہوتی ہے نہ چوری۔ البتہ حاضری اور حضوری کے شوق میں وہاں آنے والے لوگ بھول جاتے ہیں کہ انھوں نے کہاں رکھی تھی''۔ وہ بولی: ''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ وہاں جا کر تو لوگ خود کو بھی بھول جاتے ہوں گے۔ وہاں تو ہم خود بھی گم ہو جاتے ہیں۔ وہ نہیں رہتے جو وہاں جانے سے پہلے ہوتے ہیں''۔

عالمِ خواب

مَیں بھی خود کو جلد از جلد بدلنا چاہتا تھا۔ اس لیے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے مسجد

نبوی ﷺ کے مرکزی دروازے تک پہنچ گیا ۔میرے نزدیک تو اس مسجد کے سارے ہی دروازے مرکزی دروازے ہیں ۔لیکن یہ دروازہ عین گنبدِ خضرا کے سامنے تھا۔گنبدِ خضرا پر نظر پڑتے ہی میرے جسم اور دل پر وہی کیفیت طاری ہوگئی جو پہلی بار ربِ کائنات کا گھر دیکھ کر پیدا ہوئی تھی۔عصر کی اذان ہو رہی تھی۔مَیں نے بوٹ اتارے اور مسجد کے اندر داخل ہو گیا۔شبنم عورتوں کے لیے مخصوص حصے کی طرف چلی گئی تھی۔ہم دونوں نے ایک جگہ طے کر لی تھی کہ نماز کے بعد دوبارہ وہیں ملیں گے۔

یہ اپریل کا گرم دن تھا،لیکن مسجدِ نبوی ﷺ کی ٹھنڈک روح سے دل تک اتر رہی تھی۔ اتنی وسیع اور عالی شان مسجد! اللہ اللہ! مسجد نبوی ﷺ سے زیادہ شان دار کوئی مسجد ہو ہی نہیں سکتی۔یہ دنیا کے ہر کونے میں رہنے والے ہر مسلمان کا خواب ہے۔میرا خواب آج پورا ہو گیا تھا۔تعبیر میرے اردگرد حصار بنائے کھڑی تھی۔اس مسجد کے در و دیوار نے میرے بکھرتے ہوئے وجود کو سمیٹ لیا تھا۔ہزاروں عاشقانِ رسول ﷺ تڑپتے دل اور روتی آنکھوں کے ساتھ وہاں موجود تھے۔ہر دل اور ہر آنکھ میں مکینِ گنبدِ خضرا کا عشق صاف محسوس ہو رہا تھا۔مجھے یہاں ذرا بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔یوں لگ رہا تھا جیسے میں یہاں پہلے بھی آ چکا ہوں۔کبھی کبھی آپ کے سامنے آپ کی زندگی کا وہ لمحہ آن کھڑا ہوتا ہے جسے دیکھ کر آپ کو لگتا ہے کہ یہ منظر آپ خواب میں دیکھ چکے ہیں۔آج مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا تھا۔

نماز ادا کرنے کے بعد شبنم مجھے وہیں ملی جہاں مَیں نے اسے آنے کو کہا تھا۔ہم نے یہ بھی طے کیا تھا کہ مغرب اور عشا کی نمازیں ادا کرنے کے بعد ہوٹل واپس جائیں گے، چنانچہ ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ مسجد کے گرد ایک چکر لگایا جائے۔مسجد کے گرد پورا چکر لگانے کے بعد ہم ایک بار پھر گنبدِ خضرا کے قریب آ گئے۔وہیں کھڑے کھڑے نعت کے

دو شعر ہو گئے:

مکینِ گنبدِ خضرا! میں آ گیا دیکھیں
گناہ گار کی جرأت کی انتہا دیکھیں
مجھے بھی اپنے غلاموں میں کیجیے شامل
مری طرف بھی ذرا شاہِ انبیا! دیکھیں

عاشقانِ رسول ﷺ ،روضۂ مبارک کی جالیاں دیکھنے کے لیے صف بہ صف کھڑے تھے۔مجھے بھی شبنم نے اندر جانے کو کہا لیکن میں لرز کر رہ گیا۔مَیں نے کہا:’’ابھی نہیں‘‘۔ مَیں بس اتنا ہی کہہ سکا۔وہ حیران تھی کہ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟

عشا کی نماز کے بعد ہم ہوٹل میں پہنچے تو بابا بشیر،ان کی بیگم صاحبہ، بیٹی شازیہ،اکرام صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ بھی واپس آ چکے تھے۔اکرام صاحب نے چھوٹتے ہی پوچھا :’’آپ نے روضۂ مبارک دیکھا؟‘‘

مَیں نے کہا:’’روضے کے قریب جانے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔دراصل آج میری کیفیت اس نالائق طالب علم کی سی تھی جو گھر کا کام کیے بغیر سکول چلا جاتا ہے۔جب ماسٹر صاحب کہتے ہیں کہ کام دکھاؤ تو وہ دوسرے بچوں کے پیچھے چھپ کر استاد کی نظروں میں آنے سے بچنے کی کوشش کرتا ہے‘‘۔

اکرام صاحب بولے:’’آپ کب تک چھپتے رہیں گے؟ سکول کا کام تو آپ کو بہر حال دکھانا ہی ہو گا‘‘۔

بابا بشیر کی بیٹی شازیہ نے بتایا کہ ان کے ابا جی مسجد نبوی ﷺ میں ان سے بچھڑ گئے تھے۔بہت مشکل سے دوبارہ ملے ہیں۔مجھے ایک مشہور نعت کے دو مصرعے یاد آ گئے:

ہم وہاں جا کے واپس نہیں آئیں گے

اور گلیوں میں قصداً بھٹک جائیں گے

نورِ بصیرت

صبح تقریباً ساڑھے تین بجے آنکھ کھلی تو سب لوگ مسجد نبوی ﷺ کی طرف روانہ ہونے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ہم دونوں بھی جلدی جلدی تیار ہوئے اور مسجد کی طرف چل دیے۔سڑکوں پر زندگی رواں دواں تھی۔دن کا سماں تھا۔فٹ پاتھوں پر حبشی عورتیں چائنا کا سامان رکھے بیٹھی تھیں۔کوئی چیز پانچ،دس اور بیس ریال سے زیادہ کی نہ تھی۔ابھی نماز میں خاصا وقت تھا اس لیے ہم دونوں رک رک کر ان فرشی دکانوں پر پڑا سامان دیکھتے رہے اور دل ہی دل میں سوچتے رہے کہ واپسی پر کیا خریدنا ہے اور کس کے لیے خریدنا ہے؟ ہم دونوں جب بھی کوئی چیز دیکھتے تو پہلا خیال یہی آتا کہ پاکستان جا کر یہ کسے دیں گے اور کون یہ پا کر سب سے زیادہ خوش ہوگا؟

نماز ادا کرنے کے بعد میں نے ہمت کی اور روضہ رسول ﷺ کی طرف جانے والی راہداری کی طرف چل پڑا۔سینکڑوں عاشقانِ رسول ﷺ یہاں پہلے سے موجود تھے۔مجھے امام دین گجراتی کا یہ شعر یاد آ گیا:

محمدؐ کا جہاں پر آستاں ہے
زمیں کا اتنا ٹکڑا آسماں ہے

ریاض الجنہ میں داخل ہونے کے لیے تہجد کے وقت آنا پڑتا ہے میں چونکہ دیر سے آیا تھا اس لیے مجھ پر اس جنت کے دروازے بند تھے۔ریاض الجنہ میں داخل ہونے کے لیے عشق رسول ﷺ کافی نہیں سنتِ رسول ﷺ پر عمل پیرا ہونا بھی ایک شرط ہے۔پھر میں نے سوچا کہ کیا میں اتنا گناہ گار ہوں کہ روضے کی جالیاں بھی نہیں دیکھ سکتا؟ یہ سوچ کر میں

عاشقانِ رسول ﷺ کے ہجوم میں یوں داخل ہوا کہ آپ ہی آپ روضے کی جالیوں کے قریب پہنچ گیا۔جالیاں چھونے کی اجازت نہیں۔انھیں آپ صرف دیکھ سکتے ہیں۔میں نے جالیاں یوں دیکھیں کہ مجھے اپنی آنکھوں پر بھی پیار آنے لگا۔مدینے والے کا مجھ پر کرم ہو گیا تھا۔اب مجھے اس سوال کا جواب ملا کہ جب میں لاہور سے عمرے کے لیے روانہ ہونے والا تھا تو پاک ترک دوستی پر لکھنے والے محمد اسلم بھٹی نے غور سے میری آنکھوں کی طرف کیوں دیکھا تھا؟ اب میری آنکھیں مجھ سے بھی زیادہ قیمتی ہو گئی تھیں۔میری بصارت کو آپ ﷺ کی بصیرت کا نور مل گیا تھا۔مجھے اپنا ہی ایک شعر یاد آ گیا:

اپنی آنکھوں کو میں رکھ دیتا نمائش کے لیے
میں نے اک بار جو سرکار کو دیکھا ہوتا

کھجوریں کھا رہا ہوں، آبِ زم زم پی رہا ہوں

عرب ٹیکسی ڈرائیور

مسجد نبویؐ سے اپنے ہوٹل واپس آ کر ہم نے چائے کا ایک ایک کپ پیا، اب ہمارا ارادہ تھا کہ مدینے کی کھجور مارکیٹ تلاش کی جائے۔ میرے سارے پاکستانی دوستوں نے مشورہ دیا تھا کہ کھجوریں مدینہ منورہ سے خریدنا۔ انھوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ کھجور مارکیٹ مسجد نبویؐ کے نزدیک ہی ہے۔ چنانچہ ہم دونوں اپنے ہوٹل سے باہر نکلے۔ تھوڑی دور چلے تو یونہی خیال آیا کہ کیوں نہ ٹیکسی لے لی جائے۔ ابھی یہ خیال دل میں پیدا ہی ہوا تھا کہ ہمارے پاس ایک بڑی سی ٹیکسی آن رکی۔ یہ ایک بوڑھا عرب تھا۔ بھوک نے اس کے چہرے پر غربت کی داستان رقم کر رکھی تھی۔ اس کی ٹیکسی بھی اسی جیسی تھی۔ اس نے اشارے سے پوچھا کہ کہاں جانا ہے تو میں نے جواب دیا: ''کھجور مارکیٹ'' یہ دونوں لفظ اس کی سمجھ میں

آ گئے۔ ظاہر ہے کہ وہ ہر روز بے شمار پاکستانیوں کو کھجور مارکیٹ لے جاتا ہوگا۔ اتنی اردو تو انھوں نے اسے سکھا ہی دی ہوگی۔ میرا اصول ہے کہ جب بھی رکشا یا ٹیکسی کرائے پر لیتا ہوں تو ڈرائیور سے پیسے پہلے پوچھ لیتا ہوں۔ اس طرح بعد میں جھگڑے کا امکان نہیں رہتا۔ اس عرب ڈرائیور سے کھجور مارکیٹ کا کرایہ پوچھا تو بولا: ''تیس ریال'' میں نے اندازہ لگایا کہ یہ زیادہ بتا رہا ہے۔ کیونکہ مکے میں بابا بشیر اور ان کی فیملی مسجد عائشہؓ گئے تو ٹیکسی ڈرائیور نے ان سے آنے جانے کے صرف دس ریال لیے تھے۔ مسجد عائشہؓ ہوٹل سے خاصی دور تھی۔ مکہ ویسے بھی مدینے کی نسبت مہنگا شہر ہے۔ اس لیے میں نے بھانپ لیا کہ یہ شخص زیادہ پیسے مانگ رہا ہے۔ جب میں نے اسے واپس جانے کو کہا تو وہ پچیس، بیس اور پندرہ ریال سے ہوتے ہوئے دس ریال پر آ کر ٹھہر گیا۔ وہ ہر صورت میں ہمیں کھجور مارکیٹ لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا کہ مدینے کا باسی ہے۔ شاید اس کے دل میں ہم مسافروں کے لیے رحم پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ ہم دونوں اس کی ٹیکسی میں سوار ہو گئے۔ ہمارے بیٹھتے ہی اس نے دس ریال مانگ لیے۔ یہ ایک حیران کن بات تھی۔ آج تک کبھی کسی ٹیکسی ڈرائیور کو ہم نے منزل پر پہنچنے سے پہلے پیسے مانگتے نہیں دیکھا تھا۔ پہلے دل میں خیال آیا کہ مدینے میں شاید ایسا ہی ہوتا ہو، لیکن پھر میں نے جرأت کی۔ میں نے اشارے سے سمجھایا کہ پہلے کھجور مارکیٹ اتارو پھر کرایہ دوں گا۔ شاید عقل مند تھا، اس لیے اشارہ سمجھ گیا۔ اس نے ٹیکسی ایک سڑک کی طرف موڑی اور موڑ کاٹتے ہی بریک لگا دی اور انگشت شہادت سے اشارہ کرتے ہوئے بولا: ''کھجور مارکیٹ''

اب میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ وہ کرایہ پہلے ہی کیوں مانگ رہا تھا۔ ہم جب اس کی ٹیکسی میں سوار ہوئے تھے تب ہم دراصل کھجور مارکیٹ ہی کے سامنے کھڑے تھے۔ اس عرب ڈرائیور کی بے ایمانی اور دیدہ دلیری پر غصہ آیا تو میں نے دس کے بجائے پانچ ریال

اسے تھما دیے۔ پانچ ریال کا نوٹ دیکھ کر وہ ہمارے روایتی ٹیکسی ڈرائیوروں کی طرح بدتمیزی پر اتر آیا۔ چنانچہ میں نے عافیت اسی میں جانی کہ اسے دس ریال تھما دیے جائیں۔ ویسے بھی ٹیکسی میں سوار ہونے سے پہلے میں نے اس سے دس ریال طے کیے تھے۔ میں نے اسے دس ریال دیے تو اس کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔ اس کے تیور اتنے خطرناک تھے کہ اگر میں اسے دس ریال نہ دیتا تو وہ شاید زبردستی میری جیب سے نکال لیتا۔ اس کی اپنی اخلاقیات تھی، میری اپنی، ہم دونوں نے اپنی اپنی اخلاقیات کا مظاہرہ کیا۔ وہ بھی ٹھیک تھا، غلط میں بھی نہیں تھا۔

جب وہ ٹیکسی والا چلا گیا تو میں دل ہی دل میں خوب ہنسا کہ میں جو خود کو بہت عقل مند سمجھتا ہوں آج ایک ٹیکسی ڈرائیور کے ہاتھوں لٹ گیا۔

مدینے کی کھجور مارکیٹ

ٹیکسی ڈرائیور کے واقعے نے دل و دماغ میں ایک کڑواہٹ سی بھر دی تھی لیکن کھجور مارکیٹ دیکھ کر کام و دہن میں آپ ہی آپ شیرینی آ گئی تھی۔

میں سمجھا تھا کہ کھجور مارکیٹ ہماری سبزی اور پھل منڈی جیسی ہوگی جہاں ہر طرف گندگی کے ڈھیر لگے ہوئے ہوں گے۔ بدبو کے بھبھوکے اٹھ رہے ہوں گے۔ آڑھتی کھجوروں سے بھرے بڑے بڑے ٹرک لیے کھڑے ہوں گے۔ خریدار بولی لگا رہے ہوں گے۔ لیکن وہاں تو کچھ بھی نہ تھا۔ یہ ایک نہایت شان دار اور صاف ستھری ایک منزلہ ماڈرن مارکیٹ تھی۔ ہر دکان کی پیشانی پر نمبر لگے ہوئے تھے۔ دکانوں کے اندر مختلف اقسام کی کھجوریں بہت سلیقے سے رکھی گئی تھیں۔ تجاوزات کا نام تک نہ تھا۔ مارکیٹ کا برآمدہ گاہکوں کے لیے تھا۔ آپ کسی بھی دکان کے باہر رکیے، دکان دار اندر بلانے کے لیے سیلز مین شپ

کی اپنی ساری صلاحیتیں بروئے کار لائے گا۔ مہنگی کھجوریں مفت میں آپ کے ہاتھ میں تھمائے گا اور بالآخر آپ کو اپنی دکان کے اندر لے جائے گا۔ دکان کے اندر داخل ہو کر آپ مہنگی سے مہنگی کھجوریں مفت میں کھاتے رہیے، دکان دار آپ کو قطعاً منع نہیں کرے گا۔ وہ چکھنے کے لیے آپ کو اتنی کھجوریں دے گا کہ کھاتے کھاتے آپ کا منہ بھر جائے گا۔ اس معاملے میں شبنم عقل مند ثابت ہوئی اسے دکان دار چکھنے کے لیے کھجوریں دیتے اور وہ اپنے بیگ میں رکھتی جاتی۔ بے شمار مفت کھجوریں کھانے کے بعد اگر آپ دکان دار سے معذرت کر کے دکان سے باہر آ جائیں تو دکان دار ناراض نہیں ہوگا۔ البتہ وہ آپ کو روکنے کی کوشش کرے گا۔ یہاں یہ بات لائق ذکر ہے کہ کھجور مارکیٹ میں کام کرنے والے دکان داروں میں سے بیش تر پاکستانی ہیں۔ یہی پاکستانی جب اپنے ملک میں کاروبار کرتے ہیں تو ان کی اخلاقیات کا گراف پاتال کو چھو رہا ہوتا ہے یہاں یہ آسمانوں کی بلندیوں کو چھوتا ہوا نظر آیا۔

ہم دونوں کو ابھی مدینے میں مزید کئی دن قیام کرنا تھا اس لیے ہم نے طے کیا تھا کہ ابھی کھجوریں نہیں خریدیں گے۔ ابھی صرف سروے کریں گے تاکہ اندازہ ہو جائے کہ اچھی کھجور کس بھاؤ خریدی جا سکتی ہے؟ ہم دونوں اس روز تقریباً بیس پچیس دکانوں سے ونڈو شاپنگ کرتے رہے۔ شبنم کا بیگ اور میرا پیٹ کھجوروں سے بھر چکا تھا۔

اسی کھجور مارکیٹ کی کئی دکانوں پر کھجوروں کے علاوہ ایک اور شے بھی فروخت ہوتی ہے۔ یہ روغنِ بلسان تھا۔ چھوٹی چھوٹی شیشیوں میں پیک روغنِ بلسان خاصا مہنگا تھا۔ کہتے ہیں کہ یہ ایک خاص صحرائی درخت سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کا ایک قطرہ دودھ میں ملا کر پیا جائے تو جوڑوں کے درد سے نجات مل جاتی ہے۔ زخموں پر اگر یہ زیتون کے تیل میں ملا کر لگایا جائے تو زخم فوری طور پر مندمل ہو جاتے ہیں۔ اس کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ ایک غزوے میں کچھ صحابہ کرام زخمی ہوئے تو آپؐ نے ان کے زخموں پر روغنِ بلسان لگایا۔

ان کے زخم فوری طور پر مندمل ہو گئے۔ میں نے مکے میں ایک میڈیکل سٹور سے روغنِ بلسان کے بارے میں پوچھا تو وہاں بیٹھا نوجوان خاصا حیران ہوا اور بولا: ''یہ کیا چیز ہے؟ مجھ سے پہلے بھی کئی لوگ اس کے بارے میں پوچھ چکے ہیں۔'' وہیں ایک صاحب کھڑے تھے جو یقیناً پاکستانی تھے، مجھے مخاطب کر کے بولے: ''جب آپ مدینے جائیں تو کھجور مارکیٹ چلے جایئے گا۔ وہاں تقریباً ہر دکان پر یہ دستیاب ہے۔'' تب میں نے انھیں بتایا کہ میرے والد صاحب نے ایک رسالے میں اس کے بارے میں پڑھا تھا اور اس میں بھی یہی درج تھا کہ یہ مدینے کی کھجور مارکیٹ سے ملے گا۔''

والد صاحب نے روغنِ بلسان لانے کے لیے خاص طور پر کہا تھا اس لیے میں نے سوچا کہ کھجوروں کی طرح روغنِ بلسان کے بارے میں بھی پہلے اچھی طرح تحقیق کروں گا پھر خریدوں گا۔ اس مارکیٹ میں چونکہ بیرون ملک سے آنے والے لوگ کھجوریں خریدنے آتے ہیں اس لیے میرا خیال تھا کہ روغنِ بلسان یہاں مہنگے داموں ملے گا۔ بعد میں ایسا ہی ثابت ہوا۔ روغن بلسان مدینے کی تقریباً ہر دکان پر دکھائی دیا۔ ایک محلے میں واقع کریانے کی دکان پر گیا تو وہاں بھی دستیاب تھا اور ریٹ بھی کم تھا۔

کھجور مارکیٹ میں پھرتے پھرتے ہمیں دوپہر ہو گئی تو ظہر کی نماز ادا کرنے کے لیے پیدل ہی مسجد نبوی کی طرف چلے دیے۔ نماز کے بعد اپنے ہوٹل پہنچے تو بابا بشیر، اماں رشیدہ اور ان کی بیٹی شازیہ بھی واپس آ چکے تھے۔ جب ہم نے انھیں بتایا کہ ہم نے کھجور مارکیٹ تلاش کر لی ہے تو انھوں نے ہمارے ساتھ وہاں جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ طے ہوا کہ عصر کی نماز کے بعد ہم اکٹھے کھجور مارکیٹ جائیں گے۔ جب شبنم نے انھیں ٹیکسی ڈرائیور کا واقعہ سنایا تو وہ خوب ہنسے۔''

بارہ ریال کا پرس

شام کو کھجور مارکیٹ کی طرف جانے سے پہلے شبنم نے اپنے ہینڈ بیگ سے مفت کی ساری کھجوریں نکال کر اٹیچی کیس میں رکھ لی تھیں۔ اب اس کا ہینڈ بیگ خالی تھا۔ مسجد نبویؐ سے مارکیٹ کی طرف جاتے ہوئے سڑک پر عین اس جگہ جہاں صبح ٹیکسی ڈرائیور نے ہمیں اتارا تھا، مجھے ایک ننھا سا زنانہ پرس پڑا دکھائی دیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ میں وہ نہ اٹھاتا کیونکہ میرے سارے پاکستانی دوستوں نے ہدایت کی تھی کہ سعودی عرب میں زمین پر پڑی ہوئی کوئی چیز مت اُٹھانا۔ چوری کا الزام لگ سکتا ہے۔ الزام ثابت ہونے پر ہاتھ کاٹنے کی سزا ملتی ہے۔ میں نے پرس کھولا تو اس میں کل بارہ ریال اور ایک انڈین شخص کا وزیٹنگ کارڈ تھا۔ جس پر اس کا انڈیا کا ایڈریس اور فون نمبر لکھا ہوا تھا۔ ایک ہوٹل کا کارڈ بھی تھا۔ شبنم کہنے لگی: ''اللہ تعالیٰ نے حساب برابر کر دیا ہے۔ بلکہ دو ریال زیادہ دے دیے ہیں۔'' پھر خود ہی بولی: ''لیکن یہ پیسے ہمارے ہرگز نہیں۔ ہم یہ اس خاتون کو واپس دینے چلتے ہیں۔ جس کا یہ پرس ہے۔''

بابا جی بولے: ''آپ کی سوچ اچھی ہے لیکن سوچ لیں کہیں یہ کوئی سازش نہ ہو؟'' میں نے پوچھا: ''کیسی سازش؟'' بولے: ''میں پہلے بھی عمرہ کرنے آ چکا ہوں۔ بعض انڈین اور پاکستانی عورتیں یہاں صرف پیسہ کمانے آتی ہیں۔ کچھ بھیک مانگتی ہیں اور کچھ فراڈ کے ذریعے پہلی بار عمرہ کرنے کے لیے آنے والوں سے رقم نکلواتی ہیں۔'' ''وہ کیسے؟'' میرا سوال سن کر بابا جی بولے: ''فرض کریں آپ یہ پرس لے کر ہوٹل جائیں خاتون کو اس کا پرس لوٹائیں تو وہ یہ بھی تو کہہ سکتی ہے کہ اس کے پرس میں بارہ نہیں، بارہ سو ریال تھے۔'' بابا جی کی بات نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے پوچھا: ''پھر اس پرس کا کیا کریں؟''

بولے: ''یہ جو برقع پہنے حبشی خواتین بھیک مانگتی پھرتی ہیں ان میں سے کسی کو دے دیں۔''
تجویز اچھی تھی اس لیے میں نے اس پر عمل کیا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے بابا جی نے مجھے دست بریدہ ہونے سے بچالیا ہے۔

اس بار ہم کھجور مارکیٹ کی ان دکانوں کی طرف گئے، جن میں صبح نہیں جا سکے تھے۔ دکان داروں نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ پھر سب کچھ وہی ہوا جو صبح ہوا تھا۔ ہم سب نے مل کر مفت کھجوریں کھائیں۔ مدینے سے مکے جاتے ہوئے ہم کس دکان سے کھجوریں خریدیں گے؟ ہم نے دل میں سوچ لیا تھا۔ مفت کی کھجوروں سے شبنم کا ہینڈ بیگ اور میرا پیٹ ایک بار پھر بھر چکا تھا۔ کھجوریں کھا کر میں نے اپنے ہینڈ بیگ میں پڑی آبِ زم زم کی بوتل نکالی اور کھڑے کھڑے خالی کر دی۔ یہاں یہ بتاتا چلوں کہ مسجد نبویؐ میں بھی ٹھنڈے اور تازہ آبِ زم زم سے بھرے کولر ہر وقت پڑے رہتے ہیں آبِ زم زم مکے سے مدینے پہنچانے کے لیے سعودی حکومت کو چونکہ خاصا تردد کرنا پڑتا ہے اس لیے مسجد نبوی میں موجود کولروں سے آپ بڑی بوتلیں نہیں بھر سکتے البتہ ہاف لٹر کی بوتلیں آپ جتنی چاہے بھر لیں اور اپنے ہینڈ بیگ میں ڈال لیں۔ آج زندگی میں پہلی بار میں نے جی بھر کے کھجوریں کھائی تھیں۔

وہیں مارکیٹ میں پھرتے پھرتے یہ شعر ہوگیا:

کھجوریں کھا رہا ہوں، آبِ زم زم پی رہا ہوں
مدینے میں شہنشاہوں کی صورت جی رہا ہوں

ہم دیکھنے نکلے ہیں مقاماتِ مقدس

مدینے کا گداگر

کھجور مارکیٹ سے ہم سب نمازِ عشا ادا کرنے کے لیے مسجد نبویؐ کی طرف چل دیے۔ مسجد کے دروازے پر پہنچے تو ایران سے آئے ہوئے کچھ لوگ دکھائی دیے۔ ایک بڑی گاڑی ان کے قریب کھڑی تھی جس میں بہت سی عمدہ کھجوریں لدی ہوئی تھیں۔ ایک شخص گاڑی میں بیٹھا تھا اور وہ ڈسپوزل گلاسوں میں کھجوریں بھر رہا تھا۔ وہاں موجود دوسرا ایرانی ہر آنے جانے والے کو کھجوروں سے بھرے گلاس دے رہا تھا۔ انھی کا ایک ساتھی کھجوریں لینے والے ہر آدمی کو گرما گرم قہوہ ڈسپوزل کپ میں ڈال کر دیتا جاتا تھا۔ ہم چونکہ بہت سی کھجوریں کھا چکے تھے، اس لیے قہوہ پینے کو جی چاہا تو رک گئے۔ انھوں نے قہوے کے ساتھ ہم سب کو بہت سی کھجوریں بھی دیں۔ یہ کھجور کی کوئی خاص قسم تھی جو ہمیں کھجور مارکیٹ میں دکھائی نہیں دی تھی، اس لیے خوشی خوشی کھائیں اور اس کے بعد گرما گرم قہوہ پیا۔ شبنم اور

شازیہ نے جب دیکھا کہ کھجوریں لینے والوں کی تعداد بہت کم ہے تو وہ دوبارہ کھجوریں لینے چلی گئیں۔ ایرانیوں نے انھیں پھر سے بہت سی کھجوریں دے دیں، یہ دیکھ کر میں بھی دوبارہ چلا گیا۔ کھجوریں تقسیم کرنے والا شخص جانتا تھا کہ ہم پہلے کھجوریں لے چکے ہیں لیکن اس نے ایک بار پھر نہایت خندہ پیشانی سے ہم فقیروں کا کاسہ بھر دیا۔ ہم نے یہ عمل چار یا پانچ مرتبہ دہرایا لیکن مجال ہے کہ دینے والے کی پیشانی پر بل آیا ہو۔ اس وقت میں اپنے آپ کو شہرِ نبیؐ کا گداگر تصور کر رہا تھا۔ میرے خیال میں جسے شہرِ نبیؐ کی گداگری میسر آ جائے، اس کے لیے بادشاہت بے کار ہے۔

مسجدِ نبویؐ کے دروازے پر گداگری کرتے ہوئے مجھے شرم آئی نہ دینے والے کے چہرے پر رعونت اور تکبر نظر آیا۔ ہمارے گھروں میں بڑی عید کے موقع پر کوئی گداگر دوسری بار گوشت مانگنے آ جائے تو ہم اسے ڈانٹ کر بھگا دیتے ہیں کہ تم پہلے بھی آئے تھے۔ دینے کا نیا سلیقہ میں نے مسجدِ نبویؐ کے دروازے پر کھڑے ہو کر سیکھا۔ دینے والے کا دل بڑا اور ہاتھ کشادہ ہونا چاہیے۔

نماز ادا کرنے کے بعد ہم سب اپنے ہوٹل کے کمرے میں آ گئے اور جلد ہی سو گئے۔ کیونکہ صبح سویرے ہمیں مدینے کے مقدس مقامات کی زیارت کے لیے روانہ ہونا تھا۔ لیکن اس سے پہلے مسجدِ نبویؐ میں نمازِ فجر ادا کرنا تھی۔

کنڈکٹر + گائیڈ + سیلز مین

صبح کے سات بجے زیارات کے لیے لے جانے والی بس ہوٹل کے باہر موجود تھی۔ میں نے حسبِ عادت ایک فرنٹ سیٹ پر قبضہ کر لیا۔ شبنم بابا بشیر کی فیملی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ڈرائیور اور کنڈکٹر دونوں پاکستانی تھے۔ تقریباً آٹھ بجے بس چلی تو کنڈکٹر نے ونڈ سکرین

کے پاس پڑا ہوا مائیک اٹھایا اور زائرین کو خوش آمدید کہا اور ساتھ ہی بتایا کہ اپنے بائیں طرف دیکھیے، آپ کو مسجد بلالؓ دکھائی دے گی، لیکن اس وقت چونکہ یہ بند ہوتی ہے، اس لیے ہم یہاں قیام نہیں کریں گے۔ البتہ دس منٹ کی مسافت کے بعد ہم اسلامی تاریخ کی سب سے پہلی مسجد، مسجدِ قبا پہنچیں گے اور وہاں نفل ادا کریں گے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ مسجد قبا میں نفل ادا کرنے والے کو عمرے کا ثواب ملتا ہے۔ چند منٹوں کے بعد جب مسجد قبا کے سامنے بس رکنے لگی تو ہمارے کنڈکٹر پلس گائیڈ نے خبردار کیا کہ پندرہ منٹ کے بعد تمام لوگ بس میں واپس آ جائیں، دیر سے آنے والوں کو ہم یہیں چھوڑ جائیں گے۔

یہ مسجد دیکھنے کا شوق کچھ اس لیے بھی زیادہ تھا کہ اس کی تعمیر میں ہمارے نبی حضرت محمدؐ نے خود حصہ لیا تھا۔

میں سمجھا تھا کہ یہ مسجد آج بھی اسی طرح ہو گی جس طرح چودہ سو سال پہلے تھی لیکن مسجد نبویؐ کی طرح مسجد قبا بھی پہلے جیسی نہیں رہی۔ اس کی شکل و صورت بھی بدل چکی ہے۔ مسجد قبا دیکھنے میں نہایت عالی شان ہے، نہایت وسیع ہے، بہت قیمتی قالین بچھے ہوئے ہیں، اندر ہر وقت اے سی چلتے رہتے ہیں، آبِ زم زم یہاں بھی فراوانی سے میسر ہے۔ مسجد کے باہر مارکیٹ بنا دی گئی ہے جہاں سے آپ دنیا کی ہر چیز خرید سکتے ہیں۔ اس کے ارد گرد کھجور کے باغ البتہ آج بھی موجود ہیں۔ ہم سب نے نماز ادا کی۔ یہاں عصر سے پہلے بہت ہجوم رہتا ہے۔ عام طور پر ہماری مسجدیں فجر کے بعد ظہر تک خالی رہتی ہیں لیکن مسجد قبا میں آپ عصر سے پہلے جب بھی آئیں گے، یہاں نمازیوں کی ایک بڑی تعداد آپ کو نظر آئے گی۔ مسجد کے باہر مدینے کے محکمۂ باغبانی نے سبزے کا خاص اہتمام کر رکھا ہے۔ درختوں کی یوں تہذیب کاری کی گئی ہے کہ اللہ کا لفظ صاف پڑھا جاتا ہے۔ لوگ اللہ کے نام والے ان درختوں کے ساتھ کھڑے ہو کر تصویریں بنوا رہے تھے۔

مسجد قبا کے بعد ہماری اگلی منزل مسجد قبلتین تھی۔ یہ یہاں سے کچھ فاصلے پر تھی، بس کے چلتے ہی ہمارے کنڈکٹر نے ایک نیا روپ دھارلیا۔ اب وہ گائیڈ سے سیلز مین بن گیا تھا۔ بالکل ویسا سیلز مین جیسے ہمارے پاکستان میں چھوٹے روٹوں پر چلنے والی بسوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا، کہنے لگا: ''جب کوئی مسلمان حج یا عمرہ کرنے کے لیے سعودی عرب آتا ہے تو چار چیزیں یہاں سے اپنے ساتھ ضرور لے کر جاتا ہے اور یہ چار چیزیں ہیں: آب زم زم، کھجور، روغنِ بلسان اور سُرمہ۔

میں اس کی سیلز مین شپ کو دل ہی دل میں داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ دو چیزیں تو واقعی سارے عازمین حج و عمرہ اپنے ساتھ لے کر جاتے ہیں لیکن اس نے ان میں دو مزید چیزوں کا یوں اضافہ کیا کہ ہر شخص ان کے بارے میں جاننے کا آرزومند دکھائی دینے لگا۔ روغن بلسان کی اس نے اتنی تعریف بیان کی کہ بس میں موجود ہر آدمی نے اس سے دو دو چار شیشیاں خرید لیں، اس کی سیلز مین شپ کی عملی داد دینے کے لیے میں نے کچھ زیادہ شیشیاں خریدیں۔ ویسے بھی مجھے یہ خریدنا ہی تھا کیونکہ یہ میرے والد صاحب نے منگوایا تھا۔ ہمارے اس سیلز مین کا ریٹ، کھجور مارکیٹ کے دکانداروں کی نسبت کچھ کم تھا۔ میری ہمشیرگان عامرہ اشفاق اور ناصرہ حنیف نے مجھ سے خاص طور پر سُرمہ لانے کی فرمائش کی تھی، اس لیے میں نے ان کے لیے اس کامیاب سیلز مین سے سُرمہ بھی خرید لیا۔ ویسے اس سے پہلے میں مکے سے بھی کچھ سُرمہ اُن کے لیے خرید چکا تھا۔

جب وہ یہ چیزیں فروخت کر چکا تو اس نے مکے اور مدینے کے مقدس مقامات کی سی ڈیز بیچنا شروع کر دیں۔ یہ بھی خوب بکیں، میں نے بھی خریدیں۔ اس نے ایک ایک سی ڈی بیس بیس ریال میں بیچی۔ ایک سی ڈی تقریباً ساڑھے پانچ سو روپے میں پڑی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی زنبیل سے کوئی اور شے بیچنے کے لیے نکالتا، مسجدِ قبلتین آ گئی۔ یہ مسجد مدینہ

منورہ کے محلّہ بنوسلمہ میں واقع ہے، دو ہجری میں حضرت محمدؐ اور صحابہ کرامؓ نے نماز کے دوران میں اپنا رخ بیت المقدس سے کعبے کی جانب پھیرا۔ کیونکہ اس مسجد میں پہلی اور آخری بار ایک نماز دو مختلف قبلوں کی جانب رخ کر کے پڑھی گئی، اس لیے اسے ''مسجد قبلتین''، یعنی دو قبلوں والی مسجد کہا جاتا ہے۔ توسیع کے بعد اس مسجد میں اب ایک ہی وقت میں تقریباً دو ہزار نمازی، نماز ادا کر سکتے ہیں۔ اس مسجد کو موجودہ شکل دینے کے لئے تقریباً 3 کروڑ 97 لاکھ ریال خرچ کیے گئے۔ چونکہ یہاں بھی دن بھر زائرین کی بسیں آتی رہتی ہیں، اس لیے اس مسجد کے اردگرد غریب حبشی اور پاکستانی عورتیں زمین پر سامان رکھ کر بیچتی نظر آتی ہیں۔

اُحد کے میدان میں

مسجدِ قبلتین سے ہماری بس چلی تو اُحد کے میدان میں جا رکی۔ احد کا پہاڑ نہایت پرشکوہ دکھائی دے رہا تھا، میں سوچ رہا تھا کہ پہاڑوں کے سینوں میں ہمیشہ سے قیمتی چیزیں رہی ہیں، یہ کیسا عظیم پہاڑ ہے کہ اس نے ہمارے نبیؐ کو دیکھا ہے، ان کے چاہنے والوں کے قدموں کو چھوا ہے۔ اس کے سینے میں سونے چاندی سے بھی زیادہ قیمتی یادیں اور باتیں ہیں۔ لیکن آج تک کوئی ایسا کان کن پیدا نہیں ہوا جو اس عظیم پہاڑ کا سینہ چیر کر اس کے اندر چھپی ہوئی یادیں اور باتیں باہر نکال سکے۔ یہ تو اُحد کا پہاڑ ہے، پہاڑ جیسا سینہ رکھنے والے لوگ بھی کبھی کبھار ہی لب کشا ہوتے ہیں، وہ سب کچھ اپنے اندر سمیٹ کر رکھتے ہیں، کسی کو احساس نہیں ہونے دیتے کہ کب ان کے سینے میں دکھ کا الاؤ روشن ہوا اور کب یہ الاؤ خوشیوں کی پھلجھڑی بن گیا؟

مجھے تو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ احد کا یہ پہاڑ مجھ سے ہم کلام ہے، مجھے اپنے پاس بلا رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ چند ساعتیں میرے ساتھ گزارو، میں تمھارے سینے کو بھی کشادہ کر دوں

گا،میں نے بے دھیانی میں ایک پتھر اٹھایا اور اپنے بیگ میں ڈال لیا۔

ہمارے دوسرے ہم سفر ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ میں اور شبنم دوسری طرف نکل گئے، ادھر سے کچھ بچے بستے اٹھائے گزر رہے تھے، اس کھلے اور گرم میدان میں یہ منظر میرے لیے نیا بھی تھا اور حیران کن بھی۔ ہمارے ہاں اتنی شدید گرمی پڑے تو بچوں کے سکولوں میں چھٹیاں ہو جاتی ہیں، قریب پہنچے تو دیکھا کہ یہ ایک سکول تھا جسے ''مدرسہ حمزہ بن المطلب'' کا نام دیا گیا تھا۔ یہ بچوں کی چھٹی کا وقت تھا، سب بچوں نے یونیفارم کے بجائے رنگ برنگ لباس پہن رکھا تھا اور لباس بھی مغربی تھا، شاید یہ کوئی پرائیویٹ سکول تھا۔ ہم دونوں کھڑے ہو کر بچوں کو دیکھتے رہے اور بچے ہمیں۔ میں نے ان کی تصویریں بنائیں تو انھوں نے وکٹری کا نشان بنایا، میں نے دل میں سوچا کتنے خوش قسمت بچے ہیں کہ ہر روز احد کے میدان میں پڑھنے آتے ہیں لیکن یہ ان کے لیے شاید ایک عام بات ہو۔

میدان احد سے نکلے تو ہمارے کنڈکٹر پلس گائیڈ نے مائیک پر اعلان کیا کہ اب وہ ہمیں عجوہ کھجور کے ایک باغ میں لے جا رہے ہیں جہاں سے ہم عجوہ کے علاوہ دیگر اقسام کی کھجوریں خرید سکیں گے۔ اس نے ہدایت کی کہ درختوں سے کھجوریں توڑنے کی کوشش نہ کی جائے، البتہ زمین پر گری ہوئی کھجوریں آپ اٹھا سکتے ہیں، جب ہماری بس اس باغ کے اندر داخل ہوئی تو سب لوگ باغ کے ایک کونے میں بنے ہوئے اس بڑے کمرے میں چلے گئے جہاں کھجوروں کے سٹال لگے ہوئے تھے، لیکن میں اور شبنم باغ میں داخل ہو گئے۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ عجوہ کھجور کس ماحول میں کس طرح پیدا ہوتی ہے؟ عجوہ کھجور کے درخت بہت گھنے اور اونچے تھے، ابھی کھجور کچی تھی اس لئے اس کا رنگ سبز تھا۔ زمین پر لاتعداد سبز عجوہ کھجوریں گری پڑی تھیں، شبنم نے کچھ اپنے بیگ میں رکھ لیں۔ بہت سوں کے لیے یہ بھی ایک تحفہ تھا، شاید شبنم اس سبز عجوہ کھجور سے کوئی دوا تیار کرنا چاہتی تھی، گرما گرم چائے اور

ٹھنڈے ٹھار مشروب بھی وہاں فروخت ہو رہے تھے۔ میں نے چائے لی اور شبنم نے پیپسی کا ٹین پیک پیا، بڑے کمرے میں گئے تو وہاں سے ہم نے تیار عجوہ کھجور چالیس ریال فی کلو خریدی۔ ہمارے ڈرائیور نے ہارن بجایا تو ہم دونوں بس کی طرف دوڑے، تمام لوگ بس میں سوار ہو چکے تھے اور ہمارا انتظار ہو رہا تھا۔

نیکی کے ایک کام میں لطفِ نماز ہے

مدینے کا بنگالی بازار

مدینے میں ہمارا یہ معمول رہا کہ ہر روز فجر کی نماز ادا کرنے کے لیے مسجد نبویؐ چلے جاتے کچھ وقت وہاں گزارتے اور ناشتہ کرکے واپس اپنے ہوٹل میں آجاتے۔ 23 اپریل کو بھی ہم نے ایسا ہی کیا۔ ہوٹل میں کچھ وقت گزارا اور تقریباً گیارہ بجے ہم ایک بار پھر مسجد نبویؐ کی طرف نکل گئے۔ بابا بشیر اور ان کی فیملی بھی ہمارے ساتھ تھی۔ ہم سب آہستہ آہستہ چلتے ہوئے مسجد نبویؐ کے مرکزی دروازے کے سامنے سے ہوتے ہوئے بنگالی بازار کی طرف جا نکلے۔ بنگالی بازار کی وجۂ تسمیہ یہ بتائی گئی کہ یہاں موجود زیادہ دکانیں بنگالی مسلمانوں کی ہے۔ ہمارے یہ بنگالی بھائی پاکستانیوں سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ کسی شے کی قیمت میں ایک روپے کی رعایت بھی نہیں کرتے۔ بس جو قیمت بتادی، بتادی۔ وہی لیں گے جو بتایا ہے۔ یہ ان کا اصول ہے۔ پھر بھی حاجیوں اور زائرین عمرہ کی بڑی تعداد انھی سے

چیزیں خریدتی ہے یہاں کچھ دکانیں مدینے کے مقامی لوگوں کی بھی ہیں۔ بنگالیوں کے بر عکس مدینے کے مقامی لوگ زیادہ نرم دل واقع ہوئے ہیں۔ بنگالی بازار میں ایک بنگالی دکان دار کو میں نے لڑتے دیکھا تو میں اس کے پاس رُک گیا۔ میں نے اسے مخاطب کیا اور بولا: ''یار! کیوں لڑتے ہو گاہکوں سے''؟ بولا: ''یہ پاکستانی اب بھی خود کو ہمارا حاکم سمجھتے ہیں۔ خریدتے کچھ بھی نہیں۔ مفت میں ہمارا وقت ضائع کرتے ہیں''۔ وہ شاید مجھے بنگالی یا انڈین سمجھا تھا۔ اس نے اور بھی بہت کچھ کہا لیکن یہاں لکھنا شاید مناسب نہ ہو۔ میں نے جب اس بنگالی کے دل میں اپنے لیے نرم گوشہ محسوس کیا تو میں نے اس سے ٹوپیاں، عطر اور تسبیحیں خریدیں۔ چونکہ میری جیب میں رقم موجود تھی اس لیے مجھے قیمتیں مناسب لگیں۔ اس کے باوجود اس نے مجھے تھوڑی سی رعایت کردی تھی۔ رخصت ہوتے وقت میں نے اسے بتایا کہ میں بھی پاکستانی ہوں تو وہ خاصا شرمندہ ہوا اور اپنے الفاظ پر معذرت خواہ ہوا۔

مدینے کا یہ بازار اتنا بھرا پُرا ہے کہ آپ یہاں کوئی خریداری کیے بغیر پورا دن گزار سکتے ہیں۔ دکانیں تو مال اسباب سے لدی ہوئی ہیں ہی، فٹ پاتھوں پر بھی بڑی بڑی دکانیں سجی ہوئی ہیں، فٹ پاتھوں پر سامان بیچنے والوں میں زیادہ لوگ عرب تھے۔ حبشی عورتیں سیاہ برقع اور سیاہ دستانے پہنے اور سیاہ چشمہ لگائے چیزیں بیچتی نظر آتی ہیں۔ ہمارے پاکستان کی طرح وہاں بھی عملۂ بازاری کبھی کبھی آتا ہے اور جب آتا ہے اپنے ہونے کا اچھی طرح احساس دلاتا ہے۔ عملۂ بازاری کو آتے دیکھ کر فٹ پاتھوں پر بیٹھی یہ عورتیں اپنا سارا سامان چشمِ زدن میں سمیٹتی ہیں اور تیزی سے بھاگ جاتی ہیں۔ جب عملہ چلا جاتا ہے تو دوبارہ اسی جگہ آن بیٹھتی ہیں۔

اس روز بابا بشیر، اماں جی اور ان کی بیٹی شازیہ بھی ہمارے ساتھ تھی۔ انھوں نے بھی ہمارے ساتھ کئی چیزیں خریدیں۔ اچانک شازیہ کی نظر ایک شخص پر پڑی۔ وہ کوئی چیز تقسیم کر

رہا تھا۔ شبنم، شازیہ اور اماں جی ادھر لپکے تو میں بھی بابا جی کے ساتھ ان تینوں کے پیچھے چل پڑا۔ وہ کوئی مقامی عرب تھا جو وہاں کھانا تقسیم کرنے آیا تھا۔ نہایت شان دار ڈسپوزایبل برتنوں میں وہ روٹی اور سالن تقسیم کر رہا تھا۔ ہم پانچ تھے لیکن اس نے ہمیں دس لوگوں کا کھانا دے دیا۔ ہم نے اسے من وسلویٰ جانا۔ کھانا شروع کرنے سے پہلے ہم نے اپنے من وسلویٰ میں سے آدھے سے زیادہ کھانا وہاں چیزیں بیچنے والی غریب حبشی عورتوں کو دے دیا۔ یہ بات مجھے خاصی عجیب لگی کہ مدینے میں جب بھی کوئی شخص کوئی چیز تقسیم کرتا ہے، یہ حبشی عورتیں للچائی نظروں سے دیکھتی رہتی ہیں لیکن مانگنے کے لیے آگے نہیں بڑھتیں۔ جب ہم نے اپنا کھانا انھیں دیا تو انھوں نے تشکر اور احسان کے جذبات کے ساتھ رکھ لیا اور جلدی جلدی کھانے لگیں۔ میں نے دل میں سوچا کہ اللہ کی تقسیم کا انداز کتنا انوکھا اور شان دار ہے کہ ایک ہی شخص کہیں لینے والا ہے اور کہیں دینے والا۔

ایک ریال کی کھجوریں

اس بنگالی بازار میں ایک جگہ مجھے فٹ پاتھ پر ایک عرب دکھائی دیا جو کھجوریں بیچ رہا تھا۔ اس کے سامنے کھجوروں کے بڑے بڑے کریٹ کھلے پڑے ہوئے تھے۔ کھجور خریدنے یا کھانے کا ارادہ نہ تھا لیکن میں اس کے پاس رُک گیا۔ جیب میں ایک ریال کا نوٹ پڑا تھا۔ میں نے نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کھجوروں کی طرف اشارہ کیا تو وہ بہت پُھرتی سے اٹھا۔ دونوں ہاتھوں سے نہایت صاف ستھری کھجوریں اٹھائیں اور مجھے دے دیں۔ ان کھجوروں کو شبنم نے اپنے بیگ میں ڈال لیا۔ جب میں نے اس عرب کی طرف ایک ریال دوبارہ بڑھایا تو وہ مسکرایا اور اپنی انگشتِ شہادت سے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اردو میں بولا: ”اللہ کے مہمان“۔ اس عرب کی مہمان نوازی دیکھ کر مجھے

انصارِ مدینہ یاد آ گئے۔ ان کی نشانیاں آج بھی باقی ہیں۔ جذبے زندہ ہیں۔

شام کو مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد ہم دونوں ایک بار پھر اسی بنگالی بازار کی طرف آ گئے۔ میں اس بازار کو مختلف زاویوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔ دیکھنا چاہتا تھا کہ رات کو یہاں کیا رنگ ڈھنگ ہوتا ہے۔ وہی ہوا جو میں سوچ رہا تھا۔ شام کو یہ سارا علاقہ ایک ماڈرن شاپنگ مال لگ رہا تھا۔ صبح جو دکانیں بند تھیں اب کھلی تھیں اور روشنیوں سے جگمگا رہی تھیں۔ ان دکانوں میں مہنگی اشیا فروخت ہو رہی تھیں۔ ہم جیسے لوگ انھیں صرف دیکھ سکتے تھے لیکن ترکی، ایران، چین، جاپان، انڈونیشیا اور برطانیہ سے آئے ہوئے زائرینِ عمرہ ان دکانوں سے خوب خریداری کر رہے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ یہ چیزیں ان کے ملک میں نہیں ملتی ہوں گی۔ ضرور ملتی ہوں گی۔ مدینے آنے والے ہر شخص کے دل میں یہی تمنا ہوتی ہے کہ یہاں کی یادگاریں ساتھ لے جائے سو ہر شخص اپنی پسند کی چیز یادگار کے طور پر خریدتا ہے اور اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ میرا تو یہ اصول ہے کہ خواہ کسی گاؤں میں بھی جاؤں، اپنے بچوں اور قریبی رشتے داروں کے لیے وہاں کی کوئی سوغات ضرور خریدتا ہوں۔

ملتان کی روتی ہوئی عورت

صبح کی نسبت شام کو یہاں زیادہ ہجوم تھا۔ لگتا تھا کہ آج مدینے کے سارے ہوٹل خالی ہو گئے ہیں۔ لوگ ٹھنڈے کمرے چھوڑ کر سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ بنگالی بازار کی سڑک پر اس وقت مجھے لاہور کے ریگل چوک کا گمان ہوا۔ سڑک بھی مال روڈ کے مشابہ ہے۔ لوگ مٹرگشت کر رہے تھے۔ شاید مال روڈ کہتے ہی اس سڑک کو ہیں جس پر مٹرگشت کیا جائے۔ مٹرگشت کرتے ہوئے وِیل چیئر پر بیٹھی ایک بھاری بھرکم ادھیڑ عمر عورت پر میری نظر پڑی۔ وہ رو رہی تھی۔ لوگ اسے ایک نظر دیکھتے اور گزر جاتے۔ میرے دل میں خیال آیا کہ اس

عورت سے پوچھا جائے کہ اس کا کیا مسئلہ ہے؟ ہم دونوں اس کے پاس گئے۔ حُلیے سے صاف لگتا تھا کہ پاکستانی ہے۔ میں اس کے پاس جا کر رکا اور بولا: ''کیا ہوا''؟ اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جب میں نے دوبارہ پوچھا تو روتے ہوئے پنجابی میں بولی: مرن جوگیاں، میرے نال دیاں مینوں ایتھے چھڈ کے خورے کتھے ٹُر گئیاں نیں۔ میں کدوں دی ایتھے پکھی پیاسی بیٹھی آں۔ مینوں تے اپنے ہوٹل دا رستہ وی نئیں آندا''۔ اس نے ایک ہی سانس میں کئی باتیں کہہ ڈالیں۔ میں نے پنجابی میں پوچھا کہ اگر کچھ کھانا ہے تو بتا دیں بازار سے لا دیتا ہوں۔ اس خاتون میں مجھے اپنی والدہ کی تصویر دکھائی دی تھی۔ وہ بھی کبھی اسی طرح روتی ہیں اور گلہ کرتی ہیں۔ مرن جوگیاں کا لفظ بھی میں نے پہلی بار اپنی والدہ ہی سے سنا تھا۔ آج اس خاتون کی زبانی یہ لفظ سن کر عجیب سی اپنائیت کا احساس ہوا تھا۔

میری بات سن کر وہ خاتون بولی: ''کھانا مجھے نہیں چاہیے۔ بس میرے ساتھ آئی ہوئی خواتین کو تلاش کر دیں یا مجھے میرے ہوٹل تک پہنچا دیں''۔ جب میں نے ہوٹل کا نام پوچھا تو اس نے اپنے پرس سے ایک کارڈ نکالا اور میرے حوالے کر دیا اس پر لکھا تھا: ''فندق العلیاً''

واقعہ یہ تھا کہ وہ خاتون اپنی چار ہم عمر خواتین کے ساتھ ہوٹل سے نکلی تھی۔ وہ چاروں صحت مند تھیں۔ چل پھر سکتی تھیں اس لیے بازار میں خریداری کرنے چلی گئی تھیں۔ یہ محترمہ ویل چیئر استعمال کرتی تھیں اس لیے ان کی ساتھی خواتین انھیں وہیں چھوڑ گئیں کہ کون ساتھ گھسیٹتا پھرے۔ ان کا تعلق ملتان کے علاقے قدیر آباد سے تھا۔ جب میں نے اس خاتون کو بتایا کہ میں بھی ملتان ہی کا ہوں اور قدیر آباد میرا دیکھا ہوا علاقہ ہے تو وہ بہت خوش ہوئی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ قدیر آباد میں سوہن حلوے کی بہت سی مشہور دکانیں ہیں تو انھیں یقین آ گیا کہ میں ملتان ہی کا ہوں۔ میں نے ایک ٹیکسی والے سے فندق العلیا کے

بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ قریب ہی ہے۔ اس نے صرف ایک سواری دیکھ کر وہاں جانے کے صرف دس ریال مانگے۔ جب میں ٹیکسی والے سے بات کر چکا تو اس کی ساتھی خواتین بھی آ گئیں۔ انھیں دیکھ کر وہ پھر زور زور سے رونے لگی اور انھیں کوسنے لگی۔ جب تمام خواتین کو پتا چلا کہ میں نے دس ریال میں ان کے ہوٹل کے لیے ٹیکسی کرائے پر حاصل کی ہے تو وہ سب اس میں بیٹھ گئیں لیکن اب ڈرائیور نے تیس ریال کا تقاضا کیا۔ بالآخر بیس ریال پر بات ختم ہوئی۔ اس عورت کی ساتھی خواتین سب سے پہلے ٹیکسی میں بیٹھ گئیں اور سب سے آخر میں اس خاتون کو بٹھایا گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اس کی ویل چیئر فولڈ کر کے ڈگی میں رکھی۔ نماز کا ایک اپنا لطف ہے لیکن اس نیک کام کا لطف آج بھی مجھے سرشار کرتا ہے۔

اس روز میری عشاء کی نماز رہ گئی لیکن مجھے یوں لگا کہ جیسے میں نے نماز پڑھ لی ہے۔

نیکی کے ایک کام میں لطفِ نماز ہے

وادیٔ جن میں پُراسرار ہوا چلتی ہے

مسجد نبویؐ میں نماز جمعہ

عمرہ کرنے والے ہر آدمی کے قیامِ مدینہ کے دوران میں جمعتہ المبارک کا دن کم از کم ایک بار ضرور آتا ہے۔ دنیا بھر سے آئے ہوئے مسلمان مسجد نبویؐ میں باجماعت نماز ادا کرنے کی تمنا لے کر آتے ہیں اور ان کی یہ تمنا پوری ہوتی ہے۔ ہم 24 اپریل کی صبح نماز فجر ادا کر کے واپس ہوٹل میں آ کر سو گئے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ناشتے کے وقت جاگے تو ہمارے کمرے میں عید کا سماں تھا۔ سب لوگ نہا دھو کر تیار ہو رہے تھے، نئے کپڑے پہن رہے تھے، خوشبوئیں لگا رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں سب لوگ تیار ہو گئے اور نماز جمعہ ادا کرنے کے لیے مسجد نبویؐ کی طرف چل پڑے۔ ان کا خیال تھا کہ جمعتہ المبارک کو مسجد نبویؐ میں بہت زیادہ لوگ آتے ہیں، اس لیے نماز کے لیے جگہ حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وقت سے پہلے پہنچا جائے۔ سب جا چکے تھے، صرف میں اور شبنم رہ گئے تھے، سو ہم بھی جلدی جلدی تیار ہوئے اور مسجد نبویؐ میں پہنچ گئے۔ نماز میں اگر چہ ابھی بہت وقت

باقی تھا لیکن مسجد کا اندرونی حصہ تقریباً بھر چکا تھا۔ میں سب سے پیچھے جا بیٹھا، جہاں ابھی کچھ جگہ باقی تھی۔ کچھ لوگ بہت مزے سے سوئے ہوئے تھے۔ میں بھی خالی جگہ پر لیٹ گیا، وہی ہوا جو مسجدوں میں ہوتا ہے یعنی مجھے لیٹتے ہی نیند آ گئی۔ اذان کی آواز کان میں پڑی تو میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا، دیکھا تو میرے چاروں طرف نمازی ہی نمازی تھے، میں اس بات پر خاصا حیران ہوا کہ مجھے کسی شخص نے سوتے ہوئے ڈسٹرب نہیں کیا۔ یہ وسیع المشربی اور وسیع القلبی مسجد نبویؐ ہی میں ہو سکتی تھی۔ شاید لوگوں کو یہاں آ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم سب مہمان ہیں، صاحبِ خانہ کوئی اور ہے۔ جب صاحبِ خانہ ہی کو مہمان پر کوئی اعتراض نہیں تو ہم کون ہوتے ہیں، کچھ کہنے والے؟ میں نے مسجد نبویؐ میں نماز کے دوران میں، بچوں کو نمازیوں کے سامنے سے بارہا گزرتے دیکھا، لیکن مجال ہے کہ کسی نمازی نے انھیں ٹوکا ہو۔ شاید اس مسجد میں نماز ادا کرتے ہوئے کسی کو بچے نظر ہی نہیں آتے۔ اگر نماز پڑھتے ہوئے کسی کو بچے نظر آتے ہیں تو سمجھ لیجیے کہ اس کی نماز نامکمل ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک عرب، صحرا میں نماز پڑھ رہا تھا۔ اس کے سامنے سے مجنوں، لیلیٰ لیلیٰ کی صدائیں لگاتے گزرا تو عرب نے نماز چھوڑی اور مجنوں کو جا پکڑا اور کہا کہ تمھیں دکھائی نہیں دیتا کہ میں نماز پڑھ رہا ہوں۔ مجنوں بولا: ''میں لیلیٰ کے عشق میں یوں کھو گیا ہوں کہ مجھے اس کے سوا اور کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا لیکن تمھارا تمھارے خدا سے کیسا عشق ہے کہ نماز پڑھتے ہوئے تمھیں وہ نظر نہیں آیا، میں دکھائی دے گیا؟ مجنوں کی بات سن کر عرب لاجواب ہو گیا اور اپنے کیے اور کہے پر شرمندہ ہوا۔ اگر ہم بھی مجنوں کی طرح ڈوب کر نمازِ عشق ادا کرنا شروع کر دیں تو ہماری عبادتیں بھی رنگ لانے لگیں گی۔ ویسے بھی مجازی عشق، حقیقی عشق کا پہلا قدم ہوتا ہے جس نے ایک انسان سے پیار کیا وہ دراصل اللہ کی ساری مخلوق سے عشق کی ریہرسل کر رہا ہوتا ہے، اور یہ ممکن ہی نہیں کہ جو اللہ کی مخلوق سے عشق کرتا ہو، اللہ کا عشق اس کے سینے میں نہ ہو۔

فیاض کی فیاضی

نماز کے بعد بابا بشیر مل گئے۔ان کا معمول تھا کہ نماز پڑھ کر ایک مخصوص جگہ پر آن بیٹھتے، بولے: ''آؤ ناصر صاحب! آپ کو اپنے ایک عزیز سے ملواؤں۔'' میں بہت حیران ہوا کہ مسجد نبویؐ میں کہاں سے ان کا عزیز نکل آیا۔ وہ مجھے مسجد کے تہ خانے کی طرف لے چلے، یہ دیکھ کر میں حیران ہو گیا کہ مسجد نبویؐ کے نیچے نہایت وسیع و عریض کار پارکنگ تھی جس میں ایک وقت میں ہزاروں کاریں پارک ہو سکتی ہیں۔ یہ سارا پارکنگ ایریا اس وقت بھی کاروں سے بھرا ہوا تھا۔زیادہ گاڑیاں مقامی لوگوں کی تھیں جو نماز جمعہ ادا کرنے آئے تھے۔ اب لوگ نماز ادا کرنے کے بعد گاڑیاں لے کر واپس جا رہے تھے، اتنے بڑے پارکنگ ایریا کا کنٹرول ایک پاکستانی نوجوان فیاض کے حوالے تھا اور بابا بشیر اسی نوجوان سے ملوانے کے لیے مجھے یہاں لائے تھے۔ ذمہ داری سخت تھی اس لیے یہاں فیاض سے زیادہ بات چیت نہ ہو سکی۔ اس نے وعدہ کیا کہ ڈیوٹی سے فارغ ہوتے ہی ہوٹل میں ملنے آئے گا۔ ساتھ ہی اس نے کھانے کی دعوت بھی دے ڈالی۔ ظاہر ہے کہ یہ ہرگز ٹھکرائی نہیں جا سکتی تھی، بابا بشیر نے بعد میں مجھے بتایا کہ فیاض ان کے مرحوم دوست کا بیٹا ہے اور پچھلے کچھ برسوں سے سعودی عرب میں ہے۔

شام کو فیاض حسب وعدہ ہوٹل پہنچ گیا اور ہم سب کو پیدل ہی جنت البقیع کے بالمقابل واقع ایک پوش ایریا میں لے گیا جہاں اس نے پہلے ہی سے ایک عمدہ اور صاف ستھرا پاکستانی ہوٹل تلاش کر رکھا تھا، اس نے بتایا کہ وہ اپنے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا پسند کرتا ہے۔ ویسے بھی سعودی عرب میں ہوٹلوں کے کھانے کھا کر آپ بچت نہیں کر سکتے۔لیکن ہم پانچ آدمیوں کو فیاض نے بہت فیاضی سے نہایت عمدہ کھانا کھلایا۔ اس کی وضع داری اور مروت نے مجھے خاصا متاثر کیا۔ باتوں باتوں میں اس نے مجھے اور بابا بشیر کو یہ پیش کش بھی کی کہ اگر آپ کو کچھ رقم چاہیے ہو تو میں حاضر ہوں۔لیکن ہم دونوں نے شکریے کے ساتھ اس کی یہ پیش کش رد کر دی۔

شاید ایسے ہی مسافر نوازوں کے لیے حیدر علی آتش نے کہا تھا:

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

شریفی صاحب کی مہربانی

کھانا کھانے کے بعد ہم ہوٹل پہنچے تو میرے موبائل فون پر سعودی عرب کے ایک نمبر سے کال آئی۔ ان صاحب نے بتایا کہ مجھے آپ کو مدینے کے مقدس مقامات کی زیارت کرانے کا حکم ملا ہے۔ جب میں نے پوچھا کہ یہ مہربانی کس نے کی ہے تو اس شخص نے بتایا کہ ان کی فرم کے جی ایم صاحب نے جو ان دنوں پاکستان میں ہیں۔ جب میں نے اس سے جی ایم صاحب کا نام پوچھا تو بولا: ''توقیر احمد شریفی صاحب''

سارا قصہ میری سمجھ میں آ گیا تھا۔توقیر احمد شریفی صاحب سے میری پہلی مفصل ملاقات، لاہور میں حکیم سلیم اختر ملک کی دختر نیک اختر کی رخصتی کی تقریب میں ہوئی تھی۔ دو تین ادبی تقریبات میں اگرچہ ان سے پہلے بھی ملاقات ہو چکی تھی لیکن یہاں پہلی بار ان سے کھل کر مکالمہ ہوا تھا۔ اگرچہ ساٹھ ستر کے پیٹے میں ہیں لیکن ان میں نوجوانوں کی سی شوخی ہے، سلجھی ہوئی گفتگو کرتے ہیں۔ نہایت عمدہ شعر کہتے ہیں، باطن تو ان کا روشن ہے ہی، ظاہر بھی دھلا دھلا سا دکھائی دیتا ہے۔ جب میں نے انھیں بتایا کہ میں اپریل میں عمرے کے لیے روانہ ہو رہا ہوں تو انھوں نے فرمایا کہ جاتے ہوئے مجھے اپنا وہ فون نمبر دیتے جایئے گا جو آپ وہاں استعمال کریں گے۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔

اگلی صبح آٹھ بجے مجھے پھر اسی آدمی کا فون آ گیا جس نے رات مجھ سے بات کی تھی۔ بولا: ''میں گاڑی لے کر آپ کے ہوٹل کے باہر کھڑا ہوں۔ آ جائیے''۔ میں نے پوچھا کہ کون سی گاڑی ہے تو بولا پراڈو ہے۔ اس گاڑی میں چونکہ سات آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی، اس لیے میں نے بابا بشیر اور اکرام الٰہی صاحب کے اہل خانہ کو بھی ساتھ لے لیا۔

وادیٔ جن کا اَسرار

یہ نہایت شاندار گاڑی تھی، ڈرائیور نے بتایا کہ وہ ہمیں مسجد قبا، مسجد قبلتین اور میدان اُحد میں لے جانے والا ہے تو شبنم نے چپکے سے میرے کان میں کہا کہ ان مقامات پر بعد میں جائیں گے پہلے ہمیں وادیٔ جن جانا چاہیے۔ اس کی یہ تجویز سن کر میں بھی چونکا ویسے بھی ہم ایک بار ان مقامات کی زیارت کر چکے تھے چنانچہ میں نے فوراً یہ تجویز ڈرائیور کی خدمت میں پیش کر دی۔ بولا: وادیٔ جن یہاں سے تقریباً پچاس پچپن کلومیٹر دور ہے لیکن چونکہ آپ شریفی صاحب کے مہمان ہیں اس لیے آپ جہاں کہیں گے میں لے جاؤں گا۔

میں خود بھی وادیٔ جن دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ میرے چاروں بچوں نے ایک ٹیلی ویژن چینل پر وادیٔ جن پر ایک دستاویزی فلم دیکھی تھی۔ انھوں نے ہمیں عمرے کے لیے رخصت کرتے ہوئے ''حکم'' دیا تھا کہ آپ دونوں وادیٔ جن ضرور جائیے گا انھوں نے ہمیں تصویریں اور ویڈیو بنانے کی ''ہدایت'' بھی کی تھی۔ ویسے بھی میرے اندر ہر وقت ایک بچہ کلبلاتا رہتا ہے جو حیران کن منظر ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ شاید میرے بچے میرے اندر رہتے ہیں۔

ہماری گاڑی فراٹے بھرتے ہوئے وادیٔ جن کی طرف جا رہی تھی، احد کے پہاڑ کے قریب سے ہماری گاڑی گزری تو ڈرائیور نے میری فرمائش پر چند لمحے کے لیے روک لی لیکن چونکہ ہمیں وادیٔ جن پہنچنا تھا اس لیے جلد ہی دوبارہ عازمِ سفر ہوئے۔ مدینے سے باہر نکلے تو کھجوروں کے باغات دکھائی دینے لگے جو اس شہر کی پہچان ہیں۔ تقریباً پون گھنٹے کی مسافت کے بعد ڈرائیور نے کہا: اب ہم وادیٔ جن کے اندر داخل ہو چکے ہیں۔ کوئی چیز ہے جو ہماری گاڑی کو آگے بڑھنے سے روک رہی ہے۔ اس لیے میں گاڑی کو ایڑ لگا رہا ہوں''۔

سڑک ہموار تھی۔ اس کے باوجود گاڑی کو آگے بڑھنے کے لیے زور لگانا پڑ رہا تھا۔ گاڑی کے تمام مسافر ''سبحان اللہ، سبحان اللہ'' پکارنے لگے۔ سڑک پر کئی گاڑیاں کھڑی تھیں، ان میں سوار لوگ سڑک کے کنارے کھڑے تھے۔ وہ ہموار سڑک پر پانی پھینک کر ''جنوں'' کا کرشمہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ پانی ادھر جا رہا تھا جدھر سے ہماری گاڑی آ رہی تھی۔ ڈرائیور نے بتایا کہ وادیٔ جن سے آگے کوئی آبادی نہیں۔ یہ سڑک وادیٔ جن تک آتی ہے۔ وادیٔ جن کے پہاڑوں پر نظر ڈالی تو یہ بہت ہیبت ناک دکھائی دیے اور ہر پہاڑ کا رنگ، حجم اور بناوٹ دوسرے سے جدا نظر آئی۔ بعض پہاڑوں کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے بڑے بڑے جن لیٹے ہوئے ہوں۔ ممکن ہے کہ رات کے وقت یہ لیٹے ہوئے جن اٹھ بیٹھتے ہوں۔ بعض پہاڑوں پر دو دو تین تین فٹ کے پاؤں کے نشانات تھے۔ یہ نشانات اتنے بڑے تھے کہ ان میں سے ہر ایک میں پورا انسان سما جائے۔ بابا جی کی بیٹی شازیہ پاؤں کے نشانات سے اتنا خوف زدہ ہوئی کہ ان کے قریب بھی نہ گئی لیکن شبنم سب سے پہلے ان میں سے ایک نشان میں جا بیٹھی۔ چونکہ یہ ایک روشن دن تھا۔ اس لیے میں ان خوفناک پہاڑوں سے خوف زدہ نہ تھا لیکن سوچ رہا تھا کہ رات کے وقت یہاں کوئی ایک منٹ بھی نہیں گزار سکتا۔ وہاں چلنے والی ہوا بھی عجیب سی تھی۔ اس میں ایک عجب اَسرار تھا، ایک ہی رخ پر چلنے کے بجائے رخ بدل بدل کر چل رہی تھی۔ ہوا کا شور بھی ڈراؤنا سا تھا۔ ایک بلی مجھے ایک

پہاڑ کے اوپر دکھائی دی تو دل میں عجیب عجیب خیالات پیدا ہونے لگے۔ واپسی کے لیے ہم سب گاڑی میں سوار ہوئے تو ڈرائیور نے چند قدم چلنے کے بعد گاڑی گیئر سے نکال کر نیوٹرل کر دی۔ سپیڈو میٹر پر نظر ڈالی تو گاڑی نوے کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ باہر دیکھا تو پہاڑ تیزی سے پیچھے کی طرف بھاگے چلے جا رہے تھے۔ بابا بشیر، اماں جی، شازیہ، اکرام الٰہی، نگینہ، شبنم اور مجھ سمیت سب نے نعرہ لگایا ''سبحان اللہ''

میں نے دل ہی دل میں سوچا یہ جو کچھ بھی ہے، سائنس اس کو خواہ کچھ بھی کہے میرے اللہ کی قدرت ہی تو ہے۔

مدینے کی فضاؤں میں شناسائی بہت ہے

گائیڈ کی مہربانیاں

وادیِ جن سے واپس آتے آتے ہمیں دوپہر ہوگئی تھی۔ ڈرائیور کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ ہم سے جلد از جلد جان چھڑانا چاہتا ہے۔ میرے دماغ میں ایک ترکیب آئی۔ مَیں نے اپنے فون سے شریفی صاحب کا نمبر ملایا۔ پہلے اُن کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے گاڑی بھیجی پھر ڈرائیور کی تعریف کی۔ شریفی صاحب بار بار یہی کہتے رہے کہ آپ اللہ اور اس کے رسولؐ کے مہمان ہیں۔ پھر وہ بولے: ''ذرا ڈرائیور سے میری بات کرائیں''۔ میں نے فون ڈرائیور کے ہاتھ میں تھما دیا۔ شریفی صاحب نے اللہ جانے کیا کہا کہ یک بیک ڈرائیور کا رویہ اور لہجہ بدل گیا۔ بولا: ''جناب! بتائیے اب آپ کو کہاں لے چلوں؟ مَیں عشا کی نماز تک آپ کے ساتھ ہوں''۔ اُسے مدینے میں کوئی ذاتی کام تھا۔ شاید اسی لیے وہ جلد از جلد ہم سے رخصت ہونے کا آرزو مند تھا۔ وہ بولا: ''سر! آپ مجھے دو گھنٹے کی چھٹی دے

دیں۔مَیں فی الوقت آپ کو آپ کے ہوٹل اتار دیتا ہوں اور دو بجے پھر آپ کو لے لُوں گا‘‘۔مَیں نے اس کی بات مان لی۔ہمیں ہمارے ہوٹل میں اتار کر وہ چلا گیا اور وعدے کے مطابق پورے دو بجے واپس آ گیا۔

گاڑی اس دفعہ بھی وہی تھی لیکن اکرام صاحب اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ شاپنگ کے لیے چلے گئے تھے اس لیے اب ہم پانچ مسافر تھے۔مَیں، شبنم، بابا بشیر، ان کی بیگم رشیدہ بی بی اور ان کی بیٹی شازیہ۔ڈرائیور، ڈرائیور سے زیادہ گائیڈ لگ رہا تھا۔وہ راستے میں آنے والے تمام اہم اور متبرک مقامات کے بارے میں پوری معلومات فراہم کر رہا تھا۔میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ پاکستان سے آنے والے مہمانوں کو وہ اپنے افسروں کے حکم پر اسی طرح مدینے کے مقدس مقامات کی زیارت کراتا ہے۔اس نے بتایا کہ وہ اس کمپنی میں ڈرائیور کے طور پر بھرتی ہوا تھا اور ابھی تک ڈرائیور ہی ہے لیکن تنخواہ میں ہر سال خاطر خواہ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔راولپنڈی کا رہنے والا ہے اور اس کی بیوی لیڈی ڈاکٹر ہے۔

گاڑی کے روانہ ہونے کے چند منٹ کے بعد اس نے اپنے بائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اِدھر عنبریہ ریلوے اسٹیشن ہے۔ریلوے اسٹیشن کا نام سنتے ہی میرے اندر کا بچہ جاگ گیا۔مَیں فوراً بولا کہ گاڑی اسٹیشن کی جانب موڑ دو۔اُس نے گاڑی موڑ تو لی لیکن یہ بتا کر سارا مزہ کرکرا کر دیا کہ یہ ریلوے اسٹیشن بند ہے۔اس کے اندر کوئی نہیں جا سکتا۔مہربانی اس نے یہ کی کہ ہمیں عنبریہ ریلوے اسٹیشن کے قریب لے گیا اور باہر ہی سے دکھا کر گاڑی واپس موڑ لی۔یہاں سے وہ ہمیں مسجد بلالؓ، مسجدِ قبلتین، مسجدِ قبا، مسجدِ اجابہ، مسجدِ غمامہ، بیرِ عثمانؓ اور حضرت سلمان فارسیؓ کے باغ لے کر گیا۔مسجدِ نبویؐ کے ارد گرد زیادہ مساجد محفوظ تو رکھی گئی ہیں لیکن حاجیوں اور عمرہ زائرین کے لیے بند کر دی گئی ہیں۔اس کا سبب کیا ہے؟ یہ سعودی حکام ہی جانتے ہوں۔ڈرائیور اگر اس سلسلے میں کچھ جانتا بھی تھا تو اس نے ہمیں نہیں بتایا۔حضرت سلمان فارسیؓ کا کھجوروں کا باغ دیکھ کر روح تازہ ہو گئی۔اس باغ میں بغیر گٹھلی کی کھجور اُگتی ہے۔حضور پاکؐ نے حضرت سلمان فارسیؓ کو اُن کے ظالم آقا سے نجات دلانے کے لیے راتوں رات کھجور کا یہ باغ کھڑا کر دیا تھا۔اس ظالم آقا کو آج کوئی نہیں جانتا۔میرے آقا کو اگلے پچھلے سارے زمانے جانتے ہیں اور حضرت سلمان فارسیؓ کا عشق بھی تا اَبد زندہ رہے گا۔

اگرچہ ہم مسجدِ قبلتین اور مسجد قبا پہلے بھی آ چکے تھے لیکن ہمارا یہ گائیڈ ہمیں ایک بار پھر اِدھر لے آیا۔اور ایسا اس نے ہماری مرضی سے کیا تھا۔یہ ہمارے وہ مقدس مقامات ہیں کہ آپ یہاں جتنی بار آئیں، آپ کا جی نہیں بھرے گا۔اب کے ان دونوں مسجدوں میں ہم نے پہلے سے زیادہ وقت گزارا۔پہلے ہم مسجدِ قبلتین دوپہر کے وقت آئے تھے۔اس بار شام کے تقریباً پانچ بجے پہنچے۔پہلے مسجد کے باہر ہمیں ایک عارضی بازار سجا ہوا نظر آیا تھا جہاں حبشی عورتیں ضرورت کی چیزیں فروخت کر رہی تھیں۔لیکن اب وہاں کچھ بھی نہ تھا، ہمارے ڈرائیور پلس گائیڈ نے بتایا کہ یہ عارضی بازار دوپہر دو بجے تک لگا رہتا ہے۔حج اور عمرے کی خدمات فراہم کرنے والی کمپنیاں اپنے مہمانوں کو دوپہر دو بجے تک تمام زیارات کرانے کے بعد واپس ان کے ہوٹلوں میں چھوڑ آتی ہیں۔اس لیے ان تمام مقدس مقامات پر انھی اوقات میں کاروباری سرگرمیاں جاری رہتی ہیں۔البتہ میدانِ اُحد میں صبح سے شام تک بازار سجا رہتا ہے۔اسی طرح مسجدِ قبا کے ساتھ بنی ہوئی مارکیٹ چوبیس گھنٹے میں سے تقریباً بیس گھنٹے کھلی رہتی ہے۔کیونکہ یہاں زائرین چوبیس گھنٹے آتے رہتے ہیں۔

ایک بار پھر مسجدِ قبا

ہمارا یہ گائیڈ ہمیں مسجدِ قبا شام کے وقت لے کر گیا۔پہلے ہم بھاگم بھاگ یہاں ایک

بس میں سوار ہو کر آئے تھے۔ اب چونکہ اپنی سواری تھی اس لیے وقت کی کوئی پابندی نہ تھی۔ ہم سب نے یہاں نماز پڑھی۔ گھوم پھر کر ساری مسجد دیکھی۔ اس مسجد کے قریب آج بھی کھجور کا ایک گھنا باغ موجود ہے۔ مَیں سوچ رہا تھا کہ حضورؐ کے زمانے میں یہاں ہر طرف کھجوروں کے درخت ہوتے ہوں گے اور ان کے درمیان چھوٹی سی مسجد ہوتی ہوگی۔ آپؐ اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ یہاں نماز ادا کرتے ہوں گے تو کیسا لگتا ہوگا! میری قوتِ متخیلہ تیزی سے کام کر رہی تھی۔ لگتا تھا کہ میرا وائی فائی کسی روحانی طاقت سے کونیکٹ ہو رہا ہے۔ سگنل آ رہے تھے۔ یہ سگنل ڈراپ ہونے والے نہیں تھے۔ نماز پڑھ کر باہر نکلے تو ہماری گاڑی کھڑی تھی لیکن ہمارا ڈرائیور ابھی واپس نہیں آیا تھا۔ ابھی ہمیں کھڑے ہوئے چند ہی لمحے ہوئے تھے کہ کچھ نہایت حسین اور گول مٹول بچے ہماری طرف بھاگتے ہوئے آئے۔ کچھ چھوٹی موٹی چیزیں بیچ رہے تھے اور کچھ بھیک مانگ رہے تھے۔ ہم سب نے ان سے حسبِ استطاعت سلوک کیا۔ اسی اثناء میں ڈرائیور آ گیا۔ اس نے بتایا کہ یہاں بہت سے افغان رہتے ہیں۔ یہ انھی کے بچے ہیں۔ یہاں یہ اکیلے نہیں آئے۔ اس نے ایک طرف انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''وہ دیکھیے! اُدھر ان کی مائیں کھڑی ہیں''۔

میری شاعری کا امتحان

یہاں سے نکلے تو ہمارے گائیڈ پلس ڈرائیور نے بتایا کہ اب وہ ہمیں مسجدِ غمامہ لے جائے گا۔ غمامہ عربی میں بادل کو کہتے ہیں۔ اس لیے اسے بادلوں والی مسجد بھی کہتے ہیں مسجدِ غمامہ اگرچہ ہم رات کے اندھیرے میں پہنچے تھے لیکن اس کے بڑے بڑے سفید گنبد سفید بادلوں کی طرح چمک رہے تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ جب ایک بار مدینے میں کافی عرصے تک بارش نہ ہوئی تو یہاں ہمارے نبیؐ نے نمازِ استسقاء پڑھائی تھی اور بارش ہوگئی تھی۔ یہ مسجد بھی ہمیں مسجدِ بلالؓ کی طرح باہر ہی سے دکھائی گئی۔ دل تو چاہا کہ یہ مسجد اندر سے بھی دیکھی جائے لیکن اب شاید ہمارے ڈرائیور کی ڈیوٹی کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ اب ڈرائیور ہمیں ہمارے ہوٹل چھوڑنے جا رہا تھا۔ راستے میں بولا: ''شریفی صاحب بتا رہے تھے کہ آپ شاعر ہیں۔ مَیں آپ کا امتحان لیتا ہوں، اگر آپ میرے سوال کا جواب دینے میں کامیاب ہو گئے تو مَیں مان لوں گا کہ آپ شاعر ہیں''۔ مَیں نے کہا: ''پوچھو''۔ اجازت پا کر اس نے ایک شعر پڑھا اور اس کے شاعر کا نام پوچھا۔ زبان، وزن اور مفہوم کے اعتبار سے اس کا شعر ٹرکوں اور رکشاؤں کے پیچھے لکھے جانے کے بھی لائق نہ تھا لیکن چونکہ وضع داری اور مروّت بھی کوئی چیز ہے اس لیے مَیں نے اس کا پڑھا ہوا شعر تحمل سے سُنا۔ جب مَیں نے کہا کہ مَیں اس شعر کے خالق کا نام نہیں جانتا تو وہ بہت سنجیدگی سے بولا: ''پھر آپ اپنے فن میں کچے ہیں۔ ابھی آپ مزید مطالعہ کریں۔ پھر کہیں جا کر آپ شاعر بن سکیں گے''۔ اس کی بات سن کر شبنم تو زیرِ لب مسکرائی لیکن بابا بشیر، اماں جی اور شازیہ کچھ پریشان ہو گئے تھے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ مَیں شاید شاعری کے امتحان میں فیل ہو گیا ہوں۔ مَیں کمرے میں بیٹھ کر روز انھیں اپنی تازہ نعت کے شعر سناتا تھا تو وہ خوب داد دیتے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے تک مَیں اُن کا ہیرو تھا لیکن اب زیرو تھا۔ پھر مَیں نے ڈرائیور سے کہا: ''اچھا اس شعر کے خالق کا نام آپ ہی بتلا دیں''۔ فوراً بولا: ''اس شعر کے خالق کا نام ہے: ''مراد نظیر اکبر الٰہ آبادی'' شاعر کا نام سن کر میرا سر پیٹنے کو جی چاہا، اپنا نہیں ڈرائیور کا۔ اس نے جیسا شعر سنایا تھا، ویسا ہی شاعر کا نام بتایا تھا۔ مَیں نے اسے کہا: ''ایم اے اردو میں تاریخِ ادب اور کلاسیکی شاعری پڑھاتے ہوئے مجھے کئی برس ہو چکے ہیں۔ اس نام کا کوئی شاعر تاریخ میں نہیں گزرا''۔

بولا: ''نہیں جناب! نہیں۔ ابھی آپ مزید تحقیق کریں۔ یہ شعر میں نے خود ایک

رسالے میں پڑھا تھا اور شاعر کا نام بھی یہی تھا''۔اس کی بات سن کر مجھے غصہ بھی آ رہا تھا اور ہنسی بھی لیکن مَیں نے دونوں پر قابو پا لیا۔

اسی دوران میں شبنم کو خدا جانے کیا سوجھی کہ ڈرائیور کو مخاطب کر کے بولی: ''اگر آپ نے عربی مٹھائی کی کوئی دکان دیکھی ہے تو ذرا وہاں تک لے چلیں۔ چنانچہ وہ گاڑی کو تیزی سے ایک انڈر پاس کے اندر لے گیا اور باہر نکلے تو ہم ایک پُر رونق بازار میں تھے۔ یہ ویسا ہی بازار تھا جیسے ہمارے کینٹ کے علاقوں میں ہوتے ہیں۔ مدینے کی سب سے مشہور اور مہنگی مٹھائی کی دکان کے سامنے اس نے گاڑی روک دی صد شکر کہ دکان بند تھی۔ عشا کی اذان ہو رہی تھی اس لیے یہ دکان بند تھی۔ میں دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ کیونکہ اگر دکان کھلی ہوتی تو مجھے کم از کم دو تین سو ریال کی مٹھائی خریدنا پڑ جاتی۔ وہاں سے یہ پڑھا لکھا ڈرائیور ہم سب کی خواہش پر ہمیں مسجدِ نبویؐ لے آیا اور وہیں اتار کر رخصت ہو گیا۔ عشا کی نماز با جماعت ادا کی اور واپس اپنے کمرے میں آ گئے۔

کمرے میں پہنچے تو اکرام صاحب اور ان کی اہلیہ محترمہ پہلے سے وہاں موجود تھے، انھیں سفر کا سارا احوال سنایا۔ جب مَیں نے فخر سے بتایا کہ آج ہم نے مسجدِ غمامہ بھی دیکھی ہے تو اکرام صاحب مسکرائے اور کہنے لگے: ''مسجدِ غمامہ، آپ جانتے ہیں، کہاں ہے؟'' میں نے کہا: ''نہیں''۔ بولے: ''مسجدِ نبویؐ کے ساتھ ہی ہے''میں وہاں ہر روز جاتا ہوں''۔

صبح مَیں شبنم کے ساتھ فجر کے وقت مسجد نبوی گیا تو نماز ادا کرنے کے بعد ہم پوچھتے پچھاتے مسجدِ غمامہ پہنچ گئے۔ وہاں تعمیراتی کام ہو رہا تھا۔ رات ہم چونکہ گاڑی میں یہاں آئے تھے اس لیے اس کے محلِ وقوع کے بارے میں ہم اندازہ نہیں لگا سکے تھے۔ یہ مسجد فی الوقت چھوٹی سی ہے لیکن اب اس کی توسیع کا کام تیزی سے جاری ہے۔ ہم دونوں اس کے اندر داخل ہو گئے۔ اندر بہت دبیز قالین بچھے ہوئے تھے۔ ایک خادم، صفائی کر رہا تھا۔ مسجد کے پرانے قالین اٹھا کر صحن میں رکھ دیے گئے تھے، لگتا تھا کہ نئے قالین آج ہی بچھائے گئے ہیں۔ ایک طرف آبِ زم زم سے بھرا کولر رکھا تھا۔ ڈسپوزایبل گلاس بھی پڑے تھے۔ ہم نے زم زم پیا۔ مسجد کے صحن میں پڑے قالین کے ٹکڑے دیکھ کر جی میں آئی کہ اس کا ایک ٹکڑا یادگار کے طور پر ساتھ لے جاؤں۔ ایک چھوٹے ٹکڑے کی طرف اشارہ کر کے مَیں نے خادم سے پوچھا کہ یہ مَیں لے لُوں تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ چنانچہ شبنم نے جلدی سے قالین کا وہ ٹکڑا اٹھایا اور اپنے بیگ میں رکھ لیا۔ دراصل ہم دونوں ہی مدینے کی یادگاریں اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ ہم دونوں کی ہر خواہش مدینے میں آپ ہی آپ پوری ہو رہی تھی۔ وہاں گھومتے ہوئے ہم دونوں کو ایک بار بھی ایسا محسوس نہیں ہوا کہ ہم یہاں پہلی بار آئے ہیں۔

سچ یہ ہے کہ حرمین شریفین ہیں محفوظ

مسجدِ نبویؐ کی سیکیورٹی

یہ مدینے میں قیام کا چھٹا دن تھا۔ محبوبؐ کے شہر سے رخصت ہونے کا خیال دل کو پریشان کر رہا تھا۔ یہاں آتے ہوئے جتنی خوشی ہوئی تھی، یہاں سے جانے کا دکھ اس سے کچھ بڑھ کر تھا۔ دو دن کے بعد ہمیں ایک بار پھر مکّے کی طرف روانہ ہونا تھا اور دوسرا عمرہ کرنا تھا۔

ظہر کی نماز کے دوران میں، مسجدِ نبویؐ میں ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک شخص کی گود میں ڈیڑھ دو سال کی عمر کا بچہ تھا۔ اس کی بیوی شاید مسجد کے زنانہ حصے میں تھی۔ نماز کے دوران میں وہ بچہ رونے لگا۔ اس کا باپ نماز پڑھتا رہا۔ روتے روتے وہ بچہ رفتہ رفتہ چلتے ہوئے اپنے باپ سے کافی دور چلا گیا، لیکن اس شخص کا انہماک دیکھیے کہ اس نے نماز نہیں چھوڑی، بچہ گُم ہو سکتا تھا۔ وہ دراصل اپنی امی کے پاس جانا چاہتا تھا، لیکن جب ہم سب نے سلام پھیرا تو وہ بچہ خود بخود اپنے باپ کی گود میں آ کر بیٹھ گیا۔

نماز سے پہلے ایک صاحب کو دیکھا جو رحل پر سر رکھے سو رہا تھا۔ بابا بشیر نے کہا: ”ناصر صاحب! دیکھیے! اسے کہتے ہیں ضرورت ایجاد کی ماں ہے“۔ مَیں نے کہا: ”ممکن ہے یہ شخص حافظِ قرآن ہو۔ اگر یہ شخص حافظِ قرآن ہے تو اس نے رحل پر سر رکھ کر غلط نہیں کیا“۔

ہمارے پاکستانی بھائی مسجدِ نبویؐ میں بھی دوسروں کو پاؤں سیدھا کرنے کی بار بار تلقین کرتے رہتے ہیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ بس وہ ٹھیک ہیں اور دوسرے سارے غلط۔ اگر ہم اپنا یہ رویہ بدل لیں تو ہماری بہت سی برائیاں خوبیوں میں تبدیل ہو سکتی ہیں۔

مسجدِ نبویؐ کے لاتعداد دروازے ہیں۔ ہر دروازہ ہر وقت کھلا ہوتا ہے۔ آپ کسی بھی طرف سے آئیں کوئی نہ کوئی دروازہ آپ کے سامنے ہو گا۔ یہاں آتے ہوئے مَیں اکثر سوچتا کہ یہاں سیکیورٹی شاید زیادہ بہتر نہیں ہے۔ کسی بھی وقت کوئی سانحہ ہو سکتا ہے۔ ہمارے ہاں اہم مقامات پر اسلحہ بردار محافظ جگہ جگہ کھڑے نظر آتے ہیں، لیکن یہاں مَیں نے کوئی اسلحہ بردار محافظ نہیں دیکھا۔ البتہ سادہ لباس میں ملبوس کچھ اہلکار دکھائی دیتے ہیں، جو آنے والوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ جب مَیں نے فیاض سے مسجدِ نبویؐ کی سیکیورٹی کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہاں آپ لوگوں کی حفاظت کا بہت مؤثر نظام ہے۔ یہاں ہزاروں کیمرے لگے ہوئے ہیں۔ یہاں آنے والے ہر آدمی پر نظر رکھی جاتی ہے۔ مشکوک حرکات کرنے والوں پر کڑی نظر رکھی جاتی ہے۔ آپ کوئی مشکوک حرکت کر کے دیکھیں، اچانک کہیں سے کچھ لوگ آئیں گے اور آپ کو خاموشی سے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ اس وقت بھی آپ کیمرے کی آنکھ کی زد میں ہیں۔ مسجدِ نبویؐ میں زائرین کے درمیان، خفیہ والے ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ وہ نہ صرف یہ کہ آپ کی حرکات و سکنات پر

نظر رکھتے ہیں، بلکہ آپ کی بات چیت بھی سنتے ہیں۔مکہ مکرمہ میں حرم شریف میں اس سے بھی زیادہ کڑے حفاظتی اقدامات کیے گئے ہیں۔حرمین شریفین میں خدمات انجام دینے والے لوگ بھی زائرین پر نظر رکھتے ہیں۔وہ اگر کہیں بھی کوئی غیر معمولی حرکت دیکھیں یا بات چیت سنیں تو فوراً متعلقہ حکام کو اطلاع دیتے ہیں۔

جب میں نے سعودی حکومت کے حسنِ انتظام کی تعریف کی تو فیاض نے بتایا کہ مسجدِ نبویؐ کے گرد آپ بڑے بڑے ہوٹل دیکھ رہے ہیں۔یہ سب منہدم کر دیے جانے والے ہیں۔ان کے مالکوں کو اس کی اطلاع دی جا چکی ہے، لیکن مجال ہے کہ کسی نے مزاحمت کی ہو یا شور مچایا ہو۔وہ جانتے ہیں کہ سعودی حکام اس معاملے میں کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کریں گے۔اگر کسی کے ہوٹل کی مالیت پانچ کروڑ ریال ہے تو حکومت اُسے، اس سے کچھ زیادہ رقم ہی دے گی۔ان سب ہوٹلوں کو مسجدِ نبویؐ میں توسیع کے بعد دوبارہ اسی ترتیب سے جگہ فراہم کی جائے گی۔گویا کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں ہوگی۔یہاں ایسے کام کسی کو فائدہ یا نقصان پہنچانے کے لیے نہیں کیے جاتے، بلکہ اجتماعی مفاد کو پیشِ نظر رکھ کر کیے جاتے ہیں اس لیے سارے کام نہایت خوش اسلوبی سے ہو جاتے ہیں۔

آسانیاں ہی آسانیاں

اب مسجدِ نبویؐ میں آتے جاتے مجھے چونکہ کئی دن ہو چکے تھے اس لیے کئی باتیں مجھ پر ظاہر ہوئیں۔مثلاً یہ کہ آپ کسی بھی طرف سے آئیں اپنے جوتے اتار کر کہیں بھی رکھ سکتے ہیں۔جوتوں کے لیے آپ کو پلاسٹک کے شاپنگ بیگ بھی فراہم کیے جاتے ہیں۔جوتے رکھنے کے لیے کوئی ٹوکن نہیں۔مردوں اور عورتوں کے لیے جگہ جگہ بہت بڑی تعداد میں بیت الخلاء اور غسل خانے بنائے گئے ہیں اور اس سہولت کی فراہمی کے لیے کسی سے ایک ریال بھی وصول نہیں کیا جاتا۔بیت الخلا میں ہر وقت پانی اور صابن میسر رہتا ہے جونہی صابن ختم ہوتا ہے، وہاں موجود خدام نیا صابن رکھ دیتے ہیں۔سعودی حکام اگر چاہیں تو جوتوں کی حفاظت اور باتھ رومز کے استعمال پر ٹوکن سسٹم عائد کر سکتے ہیں اور روزانہ کروڑوں ریال کما سکتے ہیں، لیکن انھوں نے ثابت دکھایا ہے کہ وہ حرمین شریفین ہی کے نہیں، بلکہ مسلمانانِ عالم کے بھی خادم ہیں۔حرمین شریفین میں بنیادی انسانی ضروریات کا اتنا زیادہ خیال رکھا گیا ہے کہ اگر آپ مکہ مکرمہ یا مدینہ منورہ میں ہیں اور ہوٹل میں قیام نہیں کرنا چاہتے تو آپ حرمین شریفین میں بھی رہ سکتے ہیں۔کہیں سو جائیں، آپ کو کوئی پولیس والا تنگ نہیں کرے گا۔کوئی شخص آپ سے مٹھی گرم کرنے کو نہیں کہے گا۔

مدینے میں جس ہوٹل میں ہمارا قیام تھا اس کے ایک فلور پر ملتان کے ایک شخص نے چھوٹا سا طعام خانہ بنا رکھا تھا۔وہاں سے ہم نے کئی بار ناشتا بھی کیا اور کھانا بھی کھایا۔کھانے اور دیگر چیزوں کے نرخ وہی تھے جو باہر تھے۔سالن تازہ ہوتا تھا البتہ روٹیاں ٹھنڈی ہوتی تھیں۔حفاظتی نقطہ نظر سے ہوٹل میں تندور لگانے کی اجازت نہ تھی ورنہ طعام خانے کا مالک یہ گلہ بھی دور کرنے کو تیار تھا۔ممکن ہے کہ دوسرے ہوٹلوں میں بھی ایسا ہی ہوتا ہو۔

’’البیک‘‘ کا کھابا

ہمارے ہوٹل کے ساتھ ہی ’’البیک‘‘ نامی ایک مشہور فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ تھا جسے ہمارے کچھ پاکستانی بھائی ’’لبیک‘‘ بھی پڑھتے رہے۔کئی لوگ ملتے تو بتاتے کہ آج وہ ’’لبیک‘‘ سے کھانا کھا کر آئے ہیں۔یہاں چکن سے بنی مختلف چیزیں پیکنگ میں بھی دستیاب ہیں اور آپ وہیں بیٹھ کر بھی کھا سکتے ہیں۔میں اور شبنم کئی بار ’’البیک‘‘ گئے، لیکن ہجوم دیکھ کر واپس آ گئے۔ایک دن فیاض بھائی نے مہربانی کی کہ وہ ’’البیک‘‘ سے ہم پانچ

آدمیوں کا کھانا لے کر ہمارے ہوٹل میں آ گئے۔ ایک ڈبے میں اتنا چکن ہوتا ہے کہ دو یا تین آدمی آسانی سے پیٹ بھر سکتے ہیں۔ ہمارے بچوں نے ہمیں ''حکم'' دیا تھا کہ ''البیک'' ضرور ٹرائی کرنا ہے۔ ٹرائی میں تو ہم ناکام رہے، لیکن یہی کھانا ''من وسلویٰ'' کی طرح ہمیں ملا تو جی بھر کے کھایا۔ سعودی عرب میں مکے اور مدینے کے علاوہ دوسرے شہروں میں بھی اس کی لاتعداد شاخیں ہیں۔ شام کو ہم پانچوں نے طے کیا کہ آج ''البیک'' جائیں گے اور کھانا کھائے بغیر واپس نہیں آئیں گے۔ ہوٹل کے ایک ملازم نے یہ انکشاف کر کے ہمارا ارادہ مزید پختہ کر دیا کہ ہوٹل کے اندر سے خواتین اور بچوں کے لیے الگ سے ایک راستہ بنایا گیا ہے، جو ''البیک'' میں جا نکلتا ہے۔ مرد بھی ان کے ساتھ جا سکتے ہیں۔ گویا اسے فیملی پاتھ کہا جا سکتا ہے۔ ہم ''البیک'' کے اندر داخل ہوئے تو گاہکوں کا بہت زیادہ رش تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو ایک فیملی کیبن میں بٹھایا اور خود آرڈر دینے کاؤنٹر پر لگی لمبی قطار میں کھڑا ہو گیا۔ ریٹ انتہائی مناسب تھے۔ رش کی وجہ یہی تھی۔ ''البیک'' میں آرڈر دیتے ہوئے آپ کی جیب بھی کٹ سکتی ہے، اس لیے یہاں ضرورت سے زیادہ ہوشیار رہنا پڑتا ہے، سو میں بھی نہایت محتاط تھا۔ بیس پچیس منٹ کی صبر آزما جدوجہد کے بعد میں سرخرو ہو کر کھانے کے ڈبوں کے ساتھ کیبن میں پہنچ گیا۔

بابا بشیر اور اماں جی کو نئی نسل کا کھانا کھاتے دیکھ کر میں سوچ رہا تھا کہ پرانی نسل کے یہ دونوں افراد نئی نسل کا ساتھ دینے کا فن اچھی طرح جانتے ہیں۔ تبھی تو میں مکے سے مدینے تک ان کے ساتھ ساتھ ہوں۔ آپ حیران ہوں گے کہ دونوں نے پورے سفر میں مجھے یا شبنم کو ایک بار بھی کوئی نصیحت نہیں کی۔ اُلٹا میں ہی کئی بار انھیں اپنے کچے پکے تجربات کی روشنی میں کچھ نہ کچھ سکھانے یا بتانے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔

رات کو ہوٹل کے کمرے میں پہنچے تو میں نے اپنا فون نکالا اور ریحان چشتی کو فون کیا۔

ریحان کا تعلق لاہور کے علاقے اسلام پورہ سے ہے۔ وہ پچھلے کئی برسوں سے جدے میں مقیم ہے۔ اُس کا کزن رمیز چشتی میرا شاگرد بھی ہے اور دوست بھی۔ رمیز نے زندگی کے تجربات سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ خود میں بھی مشکل معاملات میں اس سے مشورہ کرتا ہوں۔ اس کا مشورہ ہمیشہ صائب ہوتا ہے۔ اس نے مجھے ریحان چشتی کا نمبر دیا تھا اور کہا تھا کہ فون پر اس سے ضرور رابطہ کروں۔ میں نے ریحان کا نمبر ملایا تو بات کرتے ہی اس کی دل کش شخصیت کے کئی پہلو مجھ پر عیاں ہو گئے۔ پہلا تو یہ کہ وہ بھی رمیز کی طرح باادب ہے۔ خوش اخلاق ہے۔ دردمند ہے۔ دوسروں کے کام آنے کی خواہش دل میں رکھتا ہے۔ وہ جدے میں اپنی بیگم اور بیٹی کے ساتھ رہتا ہے۔ اس نے میرا فون سنتے ہی پہلا کام تو یہ کیا کہ مجھے فون بند کرنے کو کہا اور بولا کہ میں اپنے فون سے کال کرتا ہوں۔ اس نے یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ مکے میں مجھے ملنے آئے گا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کا ٹکٹ کس ایئر لائنز کا ہے؟ جب میں نے بتایا کہ سعودی ایئر لائنز کا ہے، تو اس نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ جاتے ہوئے ایک ٹکٹ پر آپ 23، 23 کلو کے دو بیگ بغیر چارجز کے بک کرا سکتے ہیں۔ ایک دستی بیگ ساتھ لے جانے کی اجازت ہے جس میں دس کلو تک سامان رکھا جا سکتا ہے۔ پانچ لیٹر کی آبِ زم زم کی بوتل بھی آپ اپنے ساتھ پاکستان لے جا سکتے ہیں۔ گویا اکسٹھ کلو سامان ایک ٹکٹ پر پاکستان لے جایا جا سکتا ہے۔ اس کی یہ بات سُن کر مجھے خاصی حیرت ہوئی، لیکن اس نے کہا کہ جب وہ ملنے کے لیے مکے آئے گا، تو سعودی ایئر لائنز کے بیگیج رولز کی کاپی اپنے ساتھ لائے گا۔ ریحان کمپیوٹر کا اتنا ماہر تھا کہ اس نے فون پر مجھ سے میرے ٹکٹ کا نمبر مانگا تو وہ انٹرنیٹ پر سعودی ائر لائنز کی ویب سائٹ کھول کر ساری معلومات مجھے فراہم کرتا جا رہا تھا۔ میں نے مدینے سے کافی چیزیں خرید لی تھیں اس لیے مجھے حوصلہ ہوا کہ اب میں یہ سب اپنے ساتھ لے جا سکوں گا۔

مَیں نے اب یہ بھی سوچ لیا تھا کہ صبح ہم سب کھجور مارکیٹ جائیں گے اور زیادہ سے زیادہ کھجوریں خرید لیں گے، ریحان نے ایئر لائنز کی پیکیج پالیسی کا راز افشا کر دیا تھا، جبکہ سعودی ایر لائنز والے اس سلسلے میں ٹکٹ پر کچھ نہیں لکھتے جس سے زائرین اپنے سامان کے بارے میں گومگو کا شکار رہتے ہیں۔

چھتریاں کُھلتے ہوئے پھول سے کِھلتے دیکھے

☎

آدمی کی ایکسپائری ڈیٹ

27 اپریل کی رات مدینے میں ہماری آخری رات تھی۔ اس لیے صبح ہی سے دل اُداس تھا۔ مجھے اپنے بچپن میں سُنی ہوئی ایک نعت کا شعر یاد آ گیا:

ہم وہاں جا کے واپس نہیں آئیں گے
اور گلیوں میں قصداً بھٹک جائیں گے

قصداً بھٹک جانے کی بات نبیؐ سے عقیدت اور شہرِ نبیؐ سے محبت کی حد تک تو ٹھیک تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ سعودی قوانین قصداً بھٹک جانے والوں کے لیے بہت سخت ہیں۔ جو یہاں آتا ہے، واپسی کا ٹکٹ لے کر آتا ہے۔ واپسی کے ٹکٹ کے بغیر آپ یہاں حج یا عمرہ کرنے کے لیے آ ہی نہیں سکتے۔ دنیا کی حقیقت بھی یہی ہے لیکن جو آدمی دنیا میں آتا ہے وہ یہاں یوں مصروف اور مشغول ہو جاتا ہے جیسے ہمیشہ یہیں رہے گا۔ اللہ تعالیٰ

اپنے بندوں کو اگر دنیا میں بھیجتا ہے تو انھیں واپسی کا ٹکٹ دے کر بھیجتا ہے۔ واپسی کی تاریخ اللہ تعالیٰ کسی انسان کو نہیں بتاتا۔ صرف وہی جانتا ہے کہ کس انسان کو کب واپس بلانا ہے؟ یہی اسرار ہماری زندگی کو پُر لطف بناتا ہے۔ انسان ہی کیا ہر چیز کی ایک ایکسپائری ڈیٹ ہوتی ہے جو شخص جو چیز بناتا ہے وہ اس کے اوپر اس کی تیاری کی تاریخ بھی لکھتا ہے اور اس کے خاتمے کی تاریخ بھی۔ اللہ تعالیٰ انسان کا خالق ہے اور وہ جانتا ہے کہ جس انسان کو وہ بنا رہا ہے، اسے واپس کب بُلانا ہے؟ وہ ہر ایک کا حساب کتاب رکھتا ہے۔ اسی طرح حاجیوں اور عمرہ زائرین کا حساب کتاب ہمارے ایجنٹوں کے پاس ہوتا ہے۔ وہ سارا حساب رکھتے ہیں کہ کسے کب بھیجا ہے اور کب واپس آنا ہے؟ اگر آپ واپسی کے لیے ہر وقت تیار رہیں تو آپ کو زندگی کے کھونے کا صدمہ نہیں ہوتا۔ آپ بہادر اور بے خوف ہو جاتے ہیں۔

مسجدِ نبویؐ میں نمازِ فجر ادا کرنے کے بعد ہم معمول کے مطابق اپنے کمرے میں آئے۔ تھوڑی دیر آرام کے بعد ہم دونوں بابا بشیر کی فیملی کے ساتھ کھجور مارکیٹ کی طرف پیدل چل دیے۔ اب تک ہم کھجور مارکیٹ صرف ونڈو شاپنگ کرنے جاتے تھے۔ قسم قسم کی کھجوریں دیکھتے، چکھتے ان کا بھاؤ پوچھتے اور واپس آجاتے تھے۔ آج ہم خریداری کا ارادہ کر کے نکلے تھے کیونکہ ہمیں اپنا سامان بھی پیک کرنا تھا۔

ہم پانچ لوگوں کو دیکھ کر کھجور مارکیٹ کے دکان دار خاصے پُر جوش ہو گئے تھے۔ ان میں سے کئی ہمیں پہچاننے بھی لگے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہر آدمی کم از کم بیس پچیس کلو کھجور ضرور خریدتا ہے، چنانچہ ہر دکان دار کی خواہش تھی کہ ہم اس کی دکان میں داخل ہوں، کھجوریں خریدیں یا نہ خریدیں، اس کی بات ضرور سنیں۔ حسبِ معمول مفت کی کھجوریں بھی ہاتھ لگیں۔ بالآخر ایک دکان دار سے ہم نے کھجور کی تین پیٹیاں خریدیں۔ میرے حصے میں اٹھائیس کلو کی پیٹی آئی۔ عجوہ اور بغیر گٹھلی کی کھجوریں الگ خریدیں۔ کھجور مارکیٹ کے سامنے ہر وقت لوڈر گاڑیاں کھڑی رہتی ہیں۔ ہم نے بیس ریال میں ایک گاڑی کرائے پر لی اور یہ تین پیٹیاں اور پانچ مسافر پانچ منٹ میں اپنے ہوٹل کے سامنے پہنچ گئے۔ ہوٹل کے بنگالی ملازم نے دس ریال لے کر پیٹیاں ہمارے کمرے میں پہنچا دیں۔ ہم سب نے مل کر چائے پی۔ ہمارا چائے کا سامان ابھی تک ہمارے کام آرہا تھا۔

قبروں کی مساوات

کچھ وقت کمرے میں گزار کر ہم دونوں ایک بار پھر مسجدِ نبویؐ چلے گئے۔ مسجد کے ساتھ ہی جنت البقیع ہے۔ جنت البقیع میں خواتین کو جانے کی اجازت نہیں اس لیے شبنم مسجد میں چلی گئی اور میں جنت البقیع کے اندر چلا گیا۔ اس قبرستان میں حضور پاکؐ کے زمانے کی بہت سی بڑی ہستیاں اَبدی نیند سو رہی ہیں لیکن کسی قبر پر کسی کا نام درج نہیں۔ کسی قبر پر کوئی کتبہ نہیں لگایا گیا۔ قاسم جلال کا ایک شعر یہاں مجھے بہت یاد آیا:

جا کے قبروں کی مساوات کا منظر دیکھے
وہ جو کہتا ہے کہ طبقات میں بٹ کر سوچیں

ان قبروں میں محوِ آرام ہستیوں نے اُس عظیم ہستی کے دستِ حق پر بیعت کی تھی جس نے ہمیشہ مساوات کا درس دیا اور مساوات قائم کر کے دکھائی۔ جنت البقیع کی ساری قبریں کچی مٹی سے بنی ہوئی ہیں۔ کوئی قبر دوسری سے اونچی نہیں۔ سائز میں بھی سب برابر ہیں۔ کچھ لوگ قبروں کے قریب دانہ ڈال دیتے ہیں، جس کی وجہ سے جنگلی کبوتر یہاں ہر وقت غٹر غوں غٹر غوں کرتے رہتے ہیں۔ اس قبرستان میں کھڑے ہو کر آپ پر کوئی خوف طاری نہیں ہوتا۔ سبب اس کا غالباً یہ ہے کہ اس کے اندر ہمارے قبرستانوں کی طرح درخت اور جھاڑیاں نہیں۔ بس مٹی ہی مٹی ہے۔ قبرستان کی مٹی سرخی مائل ہے۔

میرے روزنامہ ''پاکستان'' کے ایک رفیقِ کار محمد عامر خورشید بھٹی نے جنت البقیع کی مٹی لانے کی فرمائش کی تھی۔ چنانچہ میں نے شرطوں کی نظر بچا کر تھوڑی سی مٹی ایک چھوٹے سے شاپنگ بیگ میں ڈال لی۔ میری عادت ہے کہ میری جیب یا بیگ میں ہر وقت ایک آدھ شاپنگ بیگ ضرور رہتا ہے جو کسی نہ کسی وقت کام آ جاتا ہے اور آج تو بہت ہی کام آیا تھا۔ اگر یہ شاپنگ بیگ میرے پاس نہ ہوتا تو ممکن ہے کہ میں اپنے دوست کی خواہش کی تکمیل نہ کر پاتا۔ میرا دِل خوشی سے سرشار تھا کہ میں اپنے ایک دوست کی خواہش پوری کرنے کے قابل ہُوا تھا۔

اس قبرستان میں ہر روز پانچ دس افراد دفنائے جاتے ہیں۔ مسجدِ نبویؐ میں ہر نماز کے بعد، کسی نہ کسی کی نمازِ جنازہ ضرور پڑھائی جاتی ہے اور مرنے والے کو جنت البقیع میں دفن کیا جاتا ہے گویا ان کی خواہش پوری ہو جاتی ہے جو کہتے ہیں:

ہم وہاں جا کے واپس نہیں آئیں گے

مدینے میں رہنے والے ایک صاحب نے بتایا کہ دفن کیے جانے والے مُردوں کی قبروں میں ایک یا دو ہفتوں کے بعد کوئی کیمیائی مادہ ڈالا جاتا ہے جس سے لاش کا نام ونشان ہی مٹ جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ بات درست ہی ہو گی۔

جنت البقیع سے باہر نکلا تو شبنم مجھے اسی مقام پر ملی، جو ہم نے نماز کے بعد ملنے کے لیے مقرر کر رکھا تھا۔ ہم دونوں صحن کے ٹھنڈے فرش پر بیٹھ گئے۔ بڑی بڑی مشینوں کے ذریعے صحن میں لگی بڑی بڑی چھتریوں کی صفائی اور مرمت کی جا رہی تھی۔ ان چھتریوں کے کھلنے اور بند ہونے کا منظر بہت دل کش لگتا ہے۔ یہ منظر ہم دونوں نے کئی بار دیکھا۔ چھتریاں کُھلتی ہیں تو پُھول سے کِھلتے محسوس ہوتے ہیں۔ فرش کی صفائی کے لیے استعمال ہونے والی ننھی ننھی گاڑیاں، ڈاجم کاریں لگتی ہیں، جس نے اپنے بچپن میں ڈاجم کار نہیں چلائی وہ یہ گاڑی بھی نہیں چلا سکتا۔ صحن میں ہر وقت زائرین کرام موجود رہتے ہیں۔ کوئی لیٹا ہوا ہے تو کوئی بیٹھا ہوا ہے۔ کہیں لوگ ٹولیاں بنائے بیٹھے ہوتے ہیں۔ ان سب سے بچتے بچاتے، صفائی والی گاڑیاں چلانا کوئی آسان کام نہیں۔ آپ صفائی کا یہ منظر دیکھنے بیٹھیں تو اس میں ایسے غرق ہوں گے کہ اِدھر اُدھر کی کچھ خبر نہ رہے گی۔ ہم دونوں بھی بچوں کی طرح یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے، اسی دوران میں ظہر کی اذان ہو گئی۔ دونوں نے نماز ادا کی۔

شاہدرے کے نوجوان

نماز ادا کرنے کے بعد میں مسجدِ نبویؐ کے ایک چبوترے پر بیٹھ گیا جو مسجد کے دروازے کے ساتھ ہی بنا ہوا تھا۔ میں آتے جاتے ہوئے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں لوگوں کے وہ تاثرات اور احساسات پڑھنا چاہتا تھا جو مسجدِ نبویؐ کے اندر داخل ہوتے ہوئے اور باہر نکلتے ہوئے ان کے چہروں پر خود بخود رقم ہو جاتے ہیں۔

مجھے وہاں بیٹھے ہوئے ابھی کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ دو نوجوان دکھائی دیے جو شکل سے پاکستانی دکھائی دیتے تھے۔ دونوں میرے قریب آن بیٹھے۔ وہ آپس میں پنجابی میں گفتگو کر رہے تھے۔ لہجے سے لگتا تھا کہ دونوں ان پڑھ ہیں۔ ان کی باتیں سن کر میں نے اُن میں سے ایک کو مخاطب کر کے پوچھا؟ ''کہاں سے آئے ہیں آپ؟'' اس نے جواب دیا: ''لاہور سے''۔ میرے مزید پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ دونوں شاہدرے کے رہنے والے ہیں۔ محنت مزدوری کرتے ہیں۔ کمیٹیاں ڈال کر رقم جمع کی اور عمرہ کرنے آ گئے۔ ان میں سے ایک بولا: ''یہاں گرمی بہت ہے''۔

میں نے کہا: ''لاہور میں کم گرمی پڑتی ہے کیا؟''

وہ بولا: '' آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن یہاں کچھ زیادہ ہے''۔ میں نے پوچھا: ''آپ

لاہور میں کرتے کیا ہیں؟'' تو وہ بولا: ''بس جی محنت مزدوری کرتے ہیں، تعلیم حاصل کر لیتے، تو شاید کچھ آرام مل جاتا، لیکن اب وہاں سارا دن گرمی میں سر کھپاتے ہیں''۔ چونکہ لوہا گرم تھا اس لیے مَیں نے کہا: ''آپ گرمی میں محنت پر پشیمان نہ ہوں۔ یہ بھی دراصل آپ سنت پر عمل کرتے ہیں۔ بس اپنے کام میں لگے رہیں۔ آپ کو اس کا پھل ملے گا، بلکہ مل گیا ہے۔ یہاں آپ کو آپ کی وہی محنت لے کر آئی ہے جس پر آپ پشیمان ہو رہے ہیں''۔ میری بات سُن کر اس نوجوان کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ پھر مَیں نے پوچھا: ''یہاں آ کر آپ اپنے اندر کیا تبدیلی محسوس کر رہے ہیں''؟ بولا: ''مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے اندر نرمی پیدا ہو گئی ہے۔ ہم لاہور میں لڑتے جھگڑتے ہوئے سخت محنت کرتے ہیں۔ اب کم از کم لڑائی جھگڑا نہیں ہو گا، بلکہ دوسروں کو بھی مَیں نرمی کا رویہ اپنانے کا مشورہ دوں گا''۔ اس کی بات سُن کر اُس کا دوسرا ساتھی بولا: ''واقعی مجھے تو اب پتا چلا ہے کہ نرمی میں کتنی سختی ہے۔ نرم حکم پر لوگ سختی سے عمل کرتے ہیں اور سختی سے کہی گئی بات کو ہوا میں اڑا دیتے ہیں''۔

تب مَیں نے کہا: ''آپ ابھی نوجوان ہیں۔ آپ اگر کسی کو کوئی اچھی بات بتائیں گے تو سننے والا اسے نصیحت نہیں سمجھے گا۔ بوڑھوں کی باتوں پر نصیحتوں کا گمان ہوتا ہے۔ شاید اسی لیے ان کی بات پر لوگ عمل بھی کم کرتے ہیں۔ جب کوئی نوجوان، بوڑھوں جیسی باتیں کرتا ہے تو لوگوں کو اس پر پیار آتا ہے۔ وہ اس کی بات غور سے سنتے ہیں۔ اس لیے آپ بھی لاہور جا کر اپنے علاقے کے لوگوں کو بدلنے کی کوشش کریں''۔ میری باتیں سن کر انھیں پتا ہی نہیں چلا کہ میں نے باتوں ہی باتوں میں انھیں کئی نصیحتیں کر ڈالی ہیں۔

ہم تینوں باتوں میں مگن تھے کہ میری گود میں پلاسٹک کی دولٹر کی ایک بوتل آن گری۔ یہ مسجد کے دروازے پر کھڑے شُرطے نے پھینکی تھی۔ مسجدِ نبویؐ میں چونکہ آبِ زم زم مکہ سے خاص تردد کے بعد پہنچتا ہے اس لیے بڑی بوتلیں بھرنے کی اجازت نہیں۔ چھوٹی چھوٹی بوتلیں آپ جتنی چاہے بھر لیں۔ شبنم کے پاس چھوٹی چھوٹی بوتلیں تھیں۔ بعد میں ہم دونوں نے ان چھوٹی بوتلوں کے ذریعے یہ دولٹر کی بوتل بھی بھر لی اور ہوٹل کے کمرے میں رکھے فریج میں رکھ دی۔

دل مدینے ہی میں رہ جائے گا، میں جانتا تھا

عرب غریب بھی ہوسکتا ہے

یہ مدینے میں ہمارا آخری دن تھا۔ رخصت کی ساعت قریب آ رہی تھی۔ ہماری عمرہ کمپنی نے ہمیں صبح ہی بتا دیا تھا کہ دوپہر کو تقریباً ڈیڑھ بجے بس آئے گی اور آپ کو مکے لے جائے گی۔ انھوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ بس مدینے کے نواح میں واقع مسجد ذوالحلیفہ رُکے گی۔ اس مسجد کو میقات کا درجہ حاصل ہے جہاں تمام عازمین عمرہ ایک بار پھر حالتِ احرام میں آ جاتے ہیں۔

دوسرے عمرے کی خوشی اپنی جگہ لیکن مدینے سے جانے کا دکھ بہت گہرا تھا۔ میں شبنم کے ساتھ مدینے کی گلیوں میں گھومتا رہتا تھا اس لیے اس شہر سے میرا اُنس مزید بڑھ گیا تھا۔ محبوب کا شہر چھوڑنا کوئی آسان کام نہیں۔ لیکن وہ عاشق ہی کیا جس نے ہجر کا مزہ نہیں لیا۔ ہجر کی کیفیت دل میں زندہ رہے تو عشق بھی زندہ رہتا ہے۔ میں اپنی زندگی کی ساڑھے چار دہائیاں عالمِ ہجر میں گزار چکا تھا۔ محبوب نے چند روز کے لیے اذنِ حضوری دیا لیکن مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میری حضوری ابھی اُدھوری ہے۔ اُدھوراپن ایک نعمت ہوتا ہے۔ آپ کو مکمل ہونے کی دُھن میں مگن رکھتا ہے۔ دوبارہ ملاقات کی تڑپ کو زندہ رکھتا ہے۔ مدینے کی یادیں سمیٹنے کے لیے میں اور شبنم دونوں مدینے کی گلیوں میں جا نکلے۔ ہمارے ہوٹل کے سامنے سے ایک بہت بڑا اوورہیڈ برج گزر رہا تھا۔ ہم دونوں اس کے نیچے سے پیدل چلتے ہوئے مدینے کے اس حصے میں جا نکلے جدھر عمرہ ادا کرنے والے لوگ کم ہی جاتے ہیں۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں اہلِ مدینہ اپنے اصل طور اطوار کے ساتھ زندگی کا ساتھ دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہم دونوں پہلے بھی اس علاقے میں کئی بار جا نکلے تھے لیکن اس بار میں سارے منظر آنکھوں میں سمیٹ لینا چاہتا تھا۔ سڑک عبور کر کے ہم ایک محلے میں جا نکلے۔ ایک چھوٹی سی دکان نظر آئی جہاں مقامی لوگ پراٹھے اور انڈے ڈبل روٹی کا ناشتہ کر رہے تھے۔ چائے بھی دستیاب تھی۔ مدینے میں پراٹھوں کی خوشبو پہلی بار آئی تھی۔ سو ہم دونوں ناشتے کے لیے دکان کے اندر جا بیٹھے۔ انڈا پراٹھا کھایا۔ گرما گرم چائے پی۔ ہمارے ہاں عام طور پر دکانوں میں لکھا ہوتا ہے: ”صفائی نصف ایمان ہے“۔ لیکن ان دکانوں میں صفائی کہیں نظر نہیں آتی۔ اس دکان کو دیکھ کر یقین آ گیا کہ صفائی واقعی نصف ایمان ہے۔ دوسرے ملکوں سے آئے ہوئے لوگ بھی وہاں بیٹھ کر ناشتا کر رہے تھے اور مقامی لوگ بھی دکھائی دیے۔ یہ سب لوگ وہ تھے جو اپنے دفتروں اور کام کی جگہوں پر جانے کے لیے گھروں سے نکلے تھے۔ عمرہ زائرین یہاں دور دور تک دکھائی نہیں دیئے۔

ناشتا کرنے کے بعد دکان سے باہر نکلے تو چند قدم پر ایک تنور دکھائی دیا جہاں گرم گرم نان فروخت ہو رہے تھے۔ تنور کے ساتھ ہی دیوار کے ساتھ ایک عمر رسیدہ عرب موچی بیٹھا تھا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ شاید سارے عرب امیر ہوتے ہیں لیکن اس موچی کی حالت دیکھ کر

اندازہ ہوا کہ غربت یہاں بھی ہے۔ یہ موچی سرمایہ دارانہ نظام کی خرابی کا بنا بنایا اشتہار تھا۔ سڑک کے جس طرف ہمارا ہوٹل تھا، وہ خاصا ترقی یافتہ تھا اور وہاں پیسے کی ریل پیل دکھائی دیتی تھی لیکن اس طرف آ کر احساس ہوا کہ ہر عرب تیل کے کنوؤں کا مالک نہیں ہوتا۔ زندگی یہاں بھی سسک سسک کر جی رہی ہے۔ بہت سی غریب خواتین ہتھ ریڑیوں پر گھریلو استعمال کی چیزیں فروخت کرتی نظر آئیں، جن کے سیاہ برقعوں پر جگہ جگہ پیوند لگے ہوئے تھے۔ مجھے فیض احمد فیض کا یہ شعر یہ منظر دیکھ کر بار بار یاد آیا:

زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

پرچون کی ایک دکان دکھائی دی تو ہم دونوں جائزہ لینے کے لیے اس کے اندر گھس گئے۔ لوگ دالیں، چنے، چینی اور چائے کی پتی خرید رہے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ یہ متوسط طبقے کا علاقہ ہے۔ حاجی صاحبان اور عمرہ زائرین چونکہ خود کو اپنے ہوٹلوں اور مسجدِ نبوی تک محدود رکھتے ہیں اس لیے وہ وہاں اپنی ضرورت کی چیزیں مہنگے داموں خریدتے ہیں اور اپنے ملک میں پہنچ کر شور مچاتے ہیں کہ سعودی عرب میں بہت مہنگائی ہے۔ ذرا سی کوشش کر کے آپ سستی اشیاء بھی ڈھونڈ سکتے ہیں۔

یہی تو ہے اپنا پن

ہم تھوڑا سا مزید چلے تو بالکل ویسی ہی گلیاں آ گئیں جیسی لاہور میں میرے محلے سنت نگر کی ہیں۔ جگہ جگہ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پڑے تھے۔ لگتا تھا کہ بلدیہ والے اِدھر کا رُخ ہی نہیں کرتے۔ حتیٰ کہ بجلی کی تاریں بھی اسی طرح الجھی ہوئی تھیں جس طرح ہمارے لاہور میں الجھی ہوتی ہیں۔ دیواروں پر سپرے کلر سے عربی میں خدا جانے کیا کچھ لکھا ہوا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر مجھے اپنائیت کا احساس ہوا۔ میں سوچ رہا تھا کہ عرب تو ہمارے بھائی نکلے۔ مَیں نے ان گلیوں کی تصویریں بنائیں تا کہ سند رہے اور وقتِ ضرورت کام آئے۔ اس علاقے سے ہم تقریباً گیارہ بجے واپسی کے لیے نکلے۔ چلتے چلتے اوور ہیڈ برج کے نیچے پہنچے تو سڑک کے درمیان بنی پتھریلی بیلٹ پر بہت سا قیمتی سامان بکھرا ہُوا دکھائی دیا۔ جب ذرا قریب پہنچے تو اس سامان کے بیچوں بیچ ایک نحیف و نزار بوڑھا شخص سوتا دکھائی دیا۔ یہ منظر ہم دونوں کے لیے حیران کن تھا۔ وہ شخص چوری کے خطرے سے بے نیاز، اپنا ہزاروں ریال کا سامان وہاں رکھے سو رہا تھا۔ اگر وہ شخص جاگ رہا ہوتا تو مَیں اس سے ضرور کچھ نہ کچھ خریدتا لیکن اس کی بے نیازی کے قربان جایئے کہ وہ وہاں سے گزرتی بھاری گاڑیوں کے شور میں بھی گہری نیند سویا ہوا تھا۔ یہاں سے نکلے تو ہم سیدھے مسجدِ نبوی پہنچ گئے۔ در و دیوار کو ایک بار پھر آنکھوں میں سمویا۔ آنکھ کے کیمرے سے تصویریں بنائیں۔ آنکھ کا کیمرا تصویریں بناتا جاتا تھا اور دل و دماغ کے میموری کارڈ میں سیو کرتا تھا۔ لطف کی بات ملاحظہ کیجیے کہ مسجدِ نبویؐ میں تصویریں بناتے ہوئے آنکھ کے کیمرے سے ڈیلیٹ آپشن خود بخود ڈیلیٹ ہو گیا۔ اس لیے یہ تصویریں آج بھی میری میموری میں باقی ہیں۔ یہاں آخری نماز ادا کی اور اپنے ہوٹل پہنچ گئے۔

ہوٹل پہنچے تو اس کے سامنے قیامت کا سماں تھا۔ کئی لگژری بسیں کھڑی تھیں اور لوگ اپنا اپنا سامان ان میں رکھوا رہے تھے۔ یہ سب وہ لوگ تھے جن کے مدینے میں قیام کا آج آخری دن تھا اب انھیں دوسرا عمرہ کرنے کے لیے ایک بار پھر مکے کی طرف روانہ ہونا تھا۔ ہم بھی انھی لوگوں میں شامل تھے۔ لہٰذا اپنے کمرے میں پہنچے۔ سامان ہم پہلے ہی پیک کر چکے تھے۔ بابا بشیر اور ان کی فیملی ہماری منتظر تھی۔ مَیں نے ہوٹل کے ایک بنگالی ملازم سے سامان بس میں رکھوانے کے لیے پہلے ہی بات کر رکھی تھی چنانچہ وہ میرے بلانے پر کمرے

میں آ گیا اور سارا سامان ٹرالی میں رکھ کر لفٹ کے ذریعے سے بس کے قریب لے آیا۔ سامان بس میں رکھوانے کے بعد ہم بس میں سوار ہو گئے۔ مدینہ دیکھنے کے شوق میں ہم بس تک پہنچنے میں خاصے لیٹ ہو گئے تھے اس لیے ہمیں آخری نشستوں پر جگہ ملی تھی۔ کتنے لطف کی بات ہے کہ مکے سے مدینے آتے ہوئے میں مدینہ دیکھنے کے شوق میں ڈرائیور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا اور اب اسی شوق نے مجھے سب سے پیچھے بٹھا دیا تھا۔ میرے نزدیک سفر کے آداب میں یہ بات بھی شامل ہے کہ جب آپ کسی کے گھر جائیں تو سب سے آگے آپ ہوں، تاکہ میزبان سے پہلی ملاقات آپ ہی کی ہو اور جب رخصت ہونے لگیں تو آپ سب سے پیچھے ہوں، تاکہ اپنے میزبان سے جاتے جاتے بھی دو باتیں کر لیں اور پیچھے مڑ کر دور تک اسے دیکھ سکیں۔ رخصت ہوتے وقت سب سے آگے تو وہی ہوگا جسے بچھڑنے کی جلدی ہوگی۔

میں نے کھڑکی سے دیکھا تو بابا بشیر اپنی بیگم صاحبہ اور بیٹی کے ساتھ ہمیں الوداع کہنے کے لیے کھڑے تھے۔ انھیں دو دن کے بعد مدینے سے مکے آنا تھا۔ اکرام صاحب بھی بس سے کچھ فاصلے پر کھڑے دکھائی دیے۔ انھیں البتہ اگلے ہی روز مکے پہنچنا تھا۔

بس چلی تو دل پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔ دو شعر آپ ہی آپ ہو گئے:

دل مدینے ہی میں رہ جائے گا، میں جانتا تھا
میرے ہمراہ نہیں آئے گا، میں جانتا تھا
اب میں جس شہر میں جاؤں گا مری آنکھوں کو
سبز گنبد ہی نظر آئے گا، میں جانتا تھا

بس جنت البقیع کی دیوار کے قریب سے گزری تو گنبدِ خضرا پر آخری نظر پڑی۔

دوسرے عمرے کی تیاری

تقریباً پندرہ منٹ کی مسافت کے بعد ڈرائیور نے ایک جگہ بس روک دی۔ یہ مسجد ذوالحلیفہ تھی۔ اسے میقات کا درجہ حاصل ہے۔ مسجد کے سامنے سیکڑوں بسیں کھڑی تھیں۔ عمرے کی ضرورت کا سارا سامان وہاں فروخت ہو رہا تھا لیکن ہم سب کچھ پہلے ہی ساتھ لائے تھے۔ احرام دستی سامان میں تھا۔ میں نے جلدی سے اپنا احرام نکالا اور شبنم نے اپنا نیا لباس جسے پہن کر وہ عمرے کی نیت کرنے والی تھی۔ وہاں بس کو صرف پندرہ منٹ رُکنا تھا۔ مسجد ذوالحلیفہ میں سیکڑوں غسل خانے تھے جو نہایت صاف ستھرے تھے۔ ٹھنڈے اور گرم پانی کے علاوہ صابن بھی موجود تھا۔ غسل کرنے اور احرام باندھنے کے بعد وہیں دو نفل ادا کیے اور تیزی سے بس کے قریب آ گیا۔ شبنم بس کے اندر نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ابھی مسجد میں تھی۔ میں اس کے انتظار میں باہر کھڑا ہو گیا جب دس پندرہ منٹ گزر گئے تو ڈرائیور مجھے دیکھ کر پھنکارنے لگا۔ حتیٰ کہ بس میں موجود دوسرے عمرہ زائرین بھی اپنے غصے کا اظہار کرنے لگے۔ سب لوگ واپس آ چکے تھے۔ بس ایک شبنم غائب تھی۔ جب ڈرائیور کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو اس نے مجھ سے مکے میں میرے ہوٹل کا نام پوچھا۔ جب مَیں نے بتا دیا تو بولا کہ تمھارا سامان وہاں اتار دوں گا تم دونوں دوسری بس میں اپنا کرایہ لگا کر آ جانا۔ مَیں اس کے اس فیصلے پر راضی ہو گیا۔ اچانک ایک شخص نے بتایا کہ ایک عورت کو اس نے ابھی یہاں سے روتے ہوئے جاتے دیکھا ہے اور لگتا ہے کہ وہ کسی کو ڈھونڈ رہی ہے۔ مَیں جلدی سے اس کی بتائی ہوئی سمت گیا تو وہاں مجھے شبنم مل گئی۔ وہ روتے ہوئے مجھے تلاش کر رہی تھی۔ میں اگرچہ حالتِ احرام میں تھا لیکن مجھے اس پر شدید غصہ آ گیا جس کا مَیں نے اظہار بھی کیا۔ اس کی ذرا سی لاپروائی کی وجہ سے بس کے سارے مسافروں کو

پریشانی اٹھانا پڑی تھی۔ اس کے پاس الگ سے فون تھا لیکن وہاں شاید جیمر ز لگے ہوئے تھے۔ اترتے ہوئے اگر وہ بس کا نمبر دیکھ لیتی یا اس کی کوئی نشانی یاد رکھ لیتی تو شاید ہمارے ہم سفر اس کوفت سے بچ جاتے جو انھیں اٹھانا پڑی تھی۔ وہ بس میں بیٹھی تو ڈرائیور نے سکھ کا سانس لیا اور گاڑی دوڑا دی۔ بس میں بیٹھ کر میں سوچ رہا تھا کہ غصے کا اظہار کر کے میں نے ممنوعاتِ عمرہ کی خلاف ورزی کی تھی۔ اس خلاف ورزی پر مجھ پر پونے دو کلو جو گندم یا اس کے برابر رقم حدودِ حرم میں خیرات کرنا واجب ہو گیا تھا۔

میرا قلم امر ہوا کعبے کے لمس سے

II

اک اور عمرہ

ہماری بس مدینے کی طرف تیزی سے بھاگی چلی جا رہی تھی۔ ہم دونوں چپ چاپ بیٹھے تھے۔ وہ دل ہی دل میں شاید کچھ پڑھ رہی تھی اور میں اپنے غصے پر پچھتا رہا تھا۔ میں نے دل میں نیت کر لی تھی کہ حدودِ حرم میں جا کر اپنی استطاعت کے مطابق خیرات کروں گا۔ ڈرائیور نے راستے میں ایک جگہ نمازِ عشاء کے لیے بس روکی تو بہت سے لوگ نیچے اتر گئے۔ کچھ بس ہی میں بیٹھے رہے۔ عورتیں پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتی رہیں کہ شبنم بس سے نیچے اتری ہے یا نہیں؟ اس نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بس میں بیٹھے رہنے کا فیصلہ کیا۔ شاید وہ ایک بار پھر گم ہو کر بس کے مسافروں کو ناراض کرنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتی تھی۔

رات کے تقریباً دس بجے ہماری بس مکے کے نواح میں پہنچ گئی تو روشنیوں کے

جھرمٹ میں بلند مینارۂ نور، زم زم کلاک ٹاور دکھائی دینے لگا۔ بس شہر کے پوش علاقوں سے ہوتے ہوئے آخر کار ہمارے ہوٹل ''المسارات'' کے سامنے جا رکی۔ مکے پہنچنے کی خوشی نے غصہ کافور کر دیا تھا لیکن خاموشی نے ابھی تک مجھے اپنے جال میں جکڑا ہوا تھا۔ اس بار ہوٹل کے منیجر نے ہمیں سب سے آخری فلور پر ایک کمرہ دیا۔ جس میں پہلے سے دو لوگ مقیم تھے۔ ایک صاحب کا تعلق راولپنڈی سے تھا اور دوسرے کا فیصل آباد سے۔ دونوں کمرے میں نہیں تھے۔ البتہ دونوں کا سامان وہاں پڑا ہوا تھا جس کے اوپر ان کے نام اور پتا جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ اس چوکور کمرے میں چار سنگل بیڈ لگے ہوئے تھے۔ ہم نے جلدی جلدی اپنا سامان رکھا اور عمرے کے لیے حرم شریف کی طرف چل دیے۔ یہ عجیب بات ہے کہ مجھے کھانا کھائے ہوئے کئی گھنٹے ہو گئے تھے لیکن بھوک اب بھی مجھ سے روٹھی ہوئی تھی۔ ایک بار پھر دنیا بھر سے آئے ہوئے لوگوں کے سمندر میں گھس گئے۔ کعبے کا طواف کیا۔ مقامِ ابراہیم پر دو نفل ادا کیے۔ اس کے بعد جی بھر کے آبِ زم زم پیا اور اپنی بھوک پیاس مٹائی۔ سعی کے لیے صفا و مروہ کی طرف گئے۔ ساڑھے تین چکر لگائے جنہیں عمرہ زائرین کے لیے سات چکر قرار دے دیا گیا ہے۔ میں نے شبنم کے انگلی برابر بال کاٹے اور دونوں بابِ ملک فہد سے باہر آ گئے۔ میں نے ایک بار پھر زم زم ٹاور کے اندر جا کر ایک سیلون سے ٹنڈ کروائی۔ وہی ملتانی نائی اور وہی دس ریال یعنی تقریباً تین سو روپے۔ ٹنڈ کرانے کے بعد جب میں نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا تو میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آپ ہی آپ آ گئی۔ میرے بالوں کے ساتھ ہی میرا سارا غصہ بھی اتر گیا تھا۔ رات کے تقریباً ایک بجے ہم دونوں ایک بار پھر اپنے ہوٹل کے کمرے میں پہنچ گئے۔ ہمارے روم میٹ ابھی تک واپس نہیں آئے تھے، لہٰذا ہم دونوں ایک بار پھر پہلے کی طرح اچھے بچوں کی طرح میاں بیوی بن گئے۔

کعبہ، کاغذ، قلم، دوات

صبح کے تقریباً سات بجے دروازے پر دستک ہوئی تو ہم جاگے۔ دروازہ کھولا تو یہ ہمارے روم میٹ تھے۔ دونوں پاکستان سے آئے تو الگ الگ تھے لیکن رات کو آتے ہی دونوں عمرہ کرنے حرم شریف چلے گئے تھے اور ساری رات وہاں گزار کر اب لوٹے تھے۔ مکے میں ایک بات عجیب محسوس ہوئی کہ یہاں آپ بہت کم سو پاتے ہیں لیکن ہرگز نہیں لگتا کہ نیند پوری نہیں ہوئی۔ یہاں آپ بہت زیادہ پیدل چلتے ہیں لیکن تھکاوٹ بالکل نہیں ہوتی۔ کھانا وقت پر نہیں کھاتے اس کے باوجود بھوک تنگ نہیں کرتی۔ یہ تینوں چیزیں کم از کم میرے لیے کسی معجزے سے کم نہ تھیں کیونکہ ایک وقت کے کھانے کے ناغے اور نیند پوری نہ ہونے کے باعث میرے سر میں درد ہونے لگتا ہے لیکن مکے میں مجھے ایسا کچھ محسوس نہیں ہوا۔ مدینے میں بھی یہی معجزہ دیکھا۔ ہمارے روم میٹ، دونوں مرد تھے۔ ان کے آتے ہی ہم نے نہا دھو کر حرم کی طرف جانے کا فیصلہ کیا۔ غسل خانہ کمرے کے اندر ہی تھا۔ پہلے شبنم نہانے کے لیے گئی۔ وہ نہا کر کپڑے بدلنا چاہتی تھی۔ غسل خانہ چونکہ بہت چھوٹا تھا اس لیے قمیص اس کے اندر تبدیل کرنا مشکل تھا۔ اس لیے وہ نہانے کے بعد، پرانی قمیص ہی پہن کر باہر آ گئی۔ ہمارا فیصل آبادی روم میٹ جاگ رہا تھا جبکہ پنڈی والا آتے ہی کسی کام سے دوبارہ باہر نکل گیا تھا۔ شبنم کے کہنے پر میں نے فیصل آبادی روم میٹ سے کہا کہ میری بیگم لباس تبدیل کرنا چاہتی ہیں، آپ براہِ کرم ذرا باہر تشریف لے جائیے۔ اس کا جواب سن کر پہلے مجھے غصہ آیا لیکن بعد میں ہنسی آ ئی۔ کہنے لگا: ''میں آنکھیں بند کر لیتا ہوں انھیں کہیں کہ آپ بے دھڑک لباس بدل لیں''۔ اس سے میں نے دوسری بار بھی درخواست کی لیکن وہ اب بھی اپنی ''پرکشش پیش کش'' پر قائم تھا۔ بالآخر شبنم نے جیسے تیسے اسی ننھے سے غسل خانے کے اندر جا کر قمیص بدل لی۔

ہم دونوں تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلے تو ہم دونوں کے دل میں پہلا خیال یہی آیا

کہ کمرہ تبدیل کرانے کی کوشش کی جائے یا ان اجنبی مہربانوں سے جان چھڑائی۔ ہوٹل کے منیجر سے بات کی تو اس نے انھی کے ساتھ گزارا کرنے کا مشورہ دیا لیکن میں نے سوچ لیا تھا کہ جیسے بھی ممکن ہوگا ان سے نجات حاصل کی جائے گی۔ ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔ اگر آپ کسی کام کی نیت دل سے کریں تو وہ ہو کے رہتا ہے۔ دوپہر کے وقت چنیوٹ والے اکرام صاحب اپنی بیگم نگینہ کے ساتھ مدینے سے مکے پہنچنے والے تھے۔ ایک پاکستانی ہوٹل سے ناشتا کرنے کے بعد ہم ایک بار پھر کبوتر چوک پہنچ گئے۔ غریب حبشی عورتیں سیاہ برقعے پہنے، چوری چھپے دال، چاول، گندم اور جو کے پیکٹ پانچ پانچ دس دس ریال میں فروخت آ رہی تھیں۔ ہم دونوں نے ایک ایک پیکٹ خریدا اور کبوتروں کے اُوپر اُچھال دیا۔ وہاں سے ہم ایک بار پھر کعبے سے ہم کلام ہونے کے لیے چلے گئے۔ میرے بیگ میں کاغذ، فاؤنٹین پن اور سیاہ روشنائی کی دوات موجود تھی۔ میں خانہء کعبہ کے اس کونے کے عین سامنے دور ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور منشیوں کی طرح کاغذ قلم اور دوات سامنے رکھ لی۔ اس سفرنامے کے پہلے باب کا کچھ حصہ میں نے وہیں بیٹھ کر لکھا۔ لکھنے سے پہلے میں نے اپنا قلم بار بار کعبے سے لگایا۔ میں ہمیشہ سیاہ روشنائی سے لکھتا ہوں اور اب تو میں شاید زندگی بھر اپنی اس روایت سے سرِمو انحراف نہ کر پاؤں۔ کعبے کو چھونے کا کمال ہے کہ میرا قلم اس سفر کی روداد لکھتے ہوئے یوں رواں ہوا کہ جو کچھ میں اپنے قارئین کو بتانا چاہتا تھا وہ سب اس نے لکھ ڈالا۔

کعبے کے سامنے بیٹھ کر لکھتے ہوئے میں بار بار ڈر بھی رہا تھا کہ کہیں سے شرطے نہ آ جائیں۔ وہ تو معمولی سی بات پر کسی کو بھی پکڑ کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ شرطے میرے پاس سے گزر رہے تھے لیکن لگتا تھا کہ میں انھیں دکھائی ہی نہیں دے رہا۔ یقیناً میرے سر پہ اس وقت سایہء رحمت تھا۔

100 ریال کے شوارمے

دوپہر کے وقت ہم دونوں باب ملک فہد سے باہر نکلے اور عین اسی مقام پر پہنچ گئے جہاں سے پہلی بار ہمیں بہت سی کھجوریں ملی تھیں۔ وہاں بہت سی دکانیں تھیں جہاں کھانے پینے کی معیاری اور صاف ستھری چیزیں بک رہی تھیں۔ میں نے سو ریال کے شوارمے اور جوس خریدے۔ یہ میری توقع سے زیادہ تھے۔ تقریباً 35 شوارمے اور اتنے ہی جوس تھے۔ دو بڑے بڑے بیگ بنا کر دکان دار نے میرے حوالے کر دیے۔ یہ دونوں بیگ زمین پر رکھ کر ہم دونوں وہیں بیٹھ گئے۔ لوگوں کو بلا بلا کر شوارمے اور جوس دیے۔ کوئی چھینا جھپٹی ہوئی نہ دھینگا مشتی۔ جس طرح لاہور میں داتا کے دربار میں ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم نے دونوں بیگ اپنے سامنے رکھ لیے اور جو شخص ہمارے قریب آتا اسے ہم خود ہی شوارما اور جوس اٹھانے کو کہتے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہر آدمی کو ایک شوارما اور ایک جوس پیش کریں گے لیکن یہاں معاملہ عجیب ہوا۔ کسی نے شوارما اٹھایا اور کسی نے صرف جوس۔ جب دونوں بیگ خالی ہو گئے تو سکھ کا سانس لیا۔ اس سارے سامان کی قیمت پونے دو کلو گندم یا جو سے کچھ بڑھ کر تھی۔ مجھے غصہ خاصا مہنگا پڑا تھا۔ اسی لیے سیانے کہتے ہیں کہ غصہ پی جانا چاہیے۔ غصہ واحد حرام شے ہے جسے پینے کا حکم ہے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ غصہ کسی اور کی غلطی کی سزا ہے جو ہم خود کو دیتے ہیں۔ کسی کی غلطی پر ہم غصہ کرتے ہیں، اپنا خون جلاتے ہیں، اپنا بلڈ پریشر ہائی کرتے ہیں اور غلطی کرنے والا اطمینان سے کھڑا دیکھتا ہے۔

یہاں سے نکلے تو ہم شارع ابراہیم خلیل سے متصل گلیوں میں جا نکلے۔ ارے یہ کیا! ان چھوٹی چھوٹی گلیوں میں سامان سے لدی پھندی بہت سی دکانیں تھیں جہاں ہر مال دو، تین، چار یا پانچ ریال میں دستیاب تھا۔ ان گلیوں میں پاکستانی کلچر کی جھلک نمایاں تھی۔

کھانے پینے کا بچا کھچا سامان، خالی، ڈبے بوتلیں، کہیں کہیں نالیوں سے ابلتا ہوا پانی دکھائی دیا تو یوں لگا جیسے میں اندرون بھاٹی گیٹ کے علاقے میں گھوم رہا ہوں۔ حتیٰ کہ وہاں گنے کے رس کی ایک دکان بھی دکھائی دی جہاں سے عرب گلاس بھر بھر کر ٹھنڈا اور میٹھا رس نوشِ جاں کر رہے تھے۔

جب ہمیں ان گلیوں میں گھومتے ہوئے کافی وقت گزر گیا تو ہم اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے۔ چنیوٹ والے اکرام صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ صبح سویرے مدینے سے مکے کے لیے روانہ ہو چکے تھے اور اب ان کے پہنچنے کا وقت ہو رہا تھا۔ ہم ہوٹل پہنچے تو وہ دونوں میاں بیوی اپنے سامان سمیت استقبالیے پر موجود تھے۔ ہم دونوں نے منصوبہ بنایا تھا کہ ان دونوں میاں بیوی کو اپنے کمرے میں جگہ دلوائیں گے اور پنڈی وال اور فیصل آبادی ساتھیوں سے کسی اور کمرے میں جانے کی درخواست کریں گے۔ میں نے ان کا سامان اپنے کمرے میں رکھوا دیا اور وہاں موجود پنڈی وال اور فیصل آبادی ساتھی کو پہلے فلور پر ایک نہایت شاندار کمرے میں جانے کو کہا۔ ہوٹل کے منیجر سے اس سلسلے میں میری پہلے ہی بات ہو چکی تھی۔ لیکن ہمارے دونوں دوستوں نے کسی اور کمرے میں جانے سے انکار کر دیا۔ شبنم اور نگینہ نے بھی ان سے پہلے فلور والے کمرے میں جانے کی درخواست کی لیکن وہ دونوں وہاں سے جانے کو تیار نہیں تھے۔ حالانکہ ان کے پاس مختصر سا سامان تھا لیکن خدا جانے کیوں وہ ضد پر اَڑ گئے تھے۔ ہمارے فیصل آبادی ساتھی بار لیش تھے۔ ایم فل اسلامیات کے طالب علم تھے لیکن اس کے باوجود وہ ہم میں سے کسی کی بات ماننے کو تیار نہ تھے۔ بالآخر اکرام صاحب اور نگینہ نے اپنا سامان اٹھایا اور پہلے فلور والے خالی کمرے کی طرف چلے۔ یہ منظر دیکھ کر پنڈی وال کے ذہن میں اللہ جانے کیا بات آئی کہ انھوں نے فیصل آبادی ساتھی کو آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی اشارہ کیا۔ دونوں بولے: ''اچھا جی ہم ہی چلے جاتے ہیں۔''

اب ہمیں ان دونوں پر بے پناہ پیار آیا کہ دیر سے سہی، ہماری بات مان تو گئے۔ ورنہ فیصل آبادی ساتھی کی تو یہاں تک ضد تھی کہ اکرام صاحب اور نگینہ بھی اسی کمرے میں رہیں لیکن وہ یہاں سے نہیں جائیں گے۔ بہر حال ان دونوں نے اپنا سامان اٹھایا۔ میں انھیں پہلے فلور پر واقع کمرے میں خود چھوڑنے گیا اور اکرام صاحب اور ان کی بیگم نگینہ کو اپنے کمرے میں لے آیا۔ مجھے یہ شعر یاد آ گیا:

قیس جنگل میں اکیلا ہے، مجھے جانے دو
خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

لیکن یہاں دو دیوانے تھے اور دو دیوانیاں تھیں۔

مکے میں مدینے کا مزہ اور ہی کچھ ہے

"

مکّے میں شب گردی

مکّے میں ہمارے آخری دو دن رہ گئے تھے اس لیے رات کو ہم ایک بار پھر حرم شریف کی روح پرور فضا سے اپنا حصہ وصول کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ حرم شریف کے سارے راستے برقی قمقموں سے جگمگاتے رہتے ہیں۔ نور کے دھارے بہتے رہتے ہیں اور مسافر آتے جاتے رہتے ہیں۔ شاید اسی کو سیلِ رنگ و نور کہتے ہیں۔ مجھے تو یہ رنگ و نور اپنے اندر اترتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ خانہ ءکعبہ کے سیاہ غلاف کو ایک بار پھر جی بھر کے چُھوا۔ طواف کیا اور رات کے تقریباً ساڑھے دس بجے اپنے کمرے میں آ کر سو گئے جہاں ہمارے دو ساتھی پہلے سے محوِ خواب تھے۔

ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ میرے فون کی بیل بجی۔ کال او کے کی تو دوسری طرف ریحان چشتی تھا۔ ریحان جدے میں ہوتا ہے اور اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہم سے ملنے ضرور آئے گا۔ وہ حسبِ وعدہ مکے پہنچ گیا تھا اور اس وقت ہمارے ہوٹل کے باہر کھڑا تھا۔ میں نیچے جا کر اسے ملا تو پہلی ہی ملاقات میں اس نے اپنائیت کے زبردست احساس سے روشناس کرایا۔ یوں لگ رہا تھا، جیسے میں اس سے پہلے بھی کہیں مل چکا ہوں۔ وہ اپنی سیاہ رنگ کی مہنگی کار کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس نے بھی دیکھتے ہی مجھے پہچان لیا تھا۔

مجھے اپنا ایک شعر یاد آ گیا:

جس سے ملتا ہوں وہ پہلے ہی ملا ہوتا ہے
شہر میں عام ہوئے اتنے فسانے میرے

ریحان میرے لیے بہت سے تحفے مثلاً عجوہ کھجور، آبِ زم زم کی پانچ پانچ لٹر کی دو بوتلیں، تسبیح، ٹوپیاں، جائے نماز، پیناڈول کی گولیاں، طاقت کے انجکشن حتیٰ کہ گولڈ لیف کی ڈبیاں بھی لایا تھا۔ اس کی دور اندیشی کی انتہا دیکھیے کہ سامان کی پیکنگ میں استعمال ہونے والے کارٹن اور نہایت اعلیٰ اور مضبوط ٹیپ بھی وہ لے آیا تھا۔ یہ سارا سامان میرے حوالے کرنے کے بعد اس نے چند ادویات الگ سے ایک ایک کر کے مجھے دکھائیں اور ایک لفافے میں بند کر کے میرے حوالے کر دیں۔ بولا ''یہ ادویات لاہور میں رمیز چشتی کو دے دیجیے گا وہ میری والدہ کو دے آئے گا''۔

ریحان نے مجھے سعودی ایئر لائنز کی بیگج پالیسی کا پرنٹ بھی دیا اور ہمارے ڈپلیکیٹ ائر ٹکٹ بھی دیے۔ بیگج پالیسی کا مطالعہ کسی بھی ملک کے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے ضرور کر لینا چاہیے۔ آپ کے پاس پالیسی کے مطابق سامان ہو تو ٹھیک وگرنہ نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ عین جہاز کی روانگی کے وقت ائر لائنز والے آپ کا سامان کھلوا دیتے ہیں۔ سامان مقررہ وزن سے زیادہ ہو تو اس کا الگ سے کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے یا ائرپورٹ ہی پر چھوڑنا پڑتا ہے۔ میں نے جب اس بیگج پالیسی کا بغور مطالعہ کیا تو اطمینان ہوا کہ سامان زیادہ ہونے کے

باوجود پاکستان پہنچ جائے گا۔

ریحان نے بتایا کہ اس کا ایک دوست جدے سے اس کے ساتھ آیا ہے اور اس وقت وہ عمرہ کرنے کے لیے حرم شریف گیا ہے اس لیے ابھی اس کے پاس کم از کم دو تین گھنٹے ہیں۔ اس نے آفر کی کہ وہ اپنی گاڑی میں مجھے دو تین گھنٹے مکّے کی سڑکوں پر گھما سکتا ہے۔ جب میں نے کہا کہ پٹرول ضائع ہوگا تو وہ ہنس دیا۔ پھر مجھے یاد آ گیا کہ سعودی عرب میں پٹرول سستا ہے اور پانی مہنگا ہے۔ چنانچہ میں نے اس کے ساتھ شب گردی کی حامی بھر لی۔ میرے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ شبنم کو ساتھ لے لوں۔ کمرے میں گیا تو وہ جاگ رہی تھی۔ جب میں نے بتایا کہ رمیز کا کزن ریحان گاڑی لایا ہے اور سیر کرانے پر بضد ہے تو وہ بھی ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوگئی۔

وہ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر ادھر اُدھر گھماتا رہا۔ میں سمجھا تھا کہ شاید صرف حرم شریف کے اردگرد کا علاقہ رات کو روشنیوں سے جگمگاتا ہے لیکن اب پتا چلا کہ مکّے کے تقریباً سارے علاقے رات کے وقت نورانی دھاروں میں نہاتے ہیں۔ مقامی امیر خواتین اپنے شوہروں یا ڈرائیوروں کے ساتھ گاڑیوں میں آتی جاتی دکھائی دیں۔ یہ خواتین بظاہر برقعوں میں ملبوس تھیں، لیکن برقعوں کے نیچے نہایت ماڈرن لباس پہنے ہوئے تھیں۔

انھیں گاڑی چلانے کی اجازت نہیں۔ اس لیے شوہر نہیں تو ڈرائیور ضرور ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ ریحان نے کے ایف سی کے سامنے گاڑی روک دی۔ ہم دونوں کو گاڑی میں بٹھا کر وہ خود لوگوں کے ہجوم میں کھو گیا۔ لڑکے، مرد اور برقع پہنے ہوئے عورتیں کے ایف سی کے سامنے سے یوں گزر رہی تھیں جیسے مہنگے کھلونوں کی دکان کے سامنے سے غریب آدمی اپنے بچوں کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ریحان آیا تو اس کے ہاتھ میں ''البیک'' کے چار ڈبے تھے۔ بولا: ''اندر بہت رش تھا۔ آپ دیکھ رہے ہیں رات کے تقریباً

ساڑھے بارہ بج رہے ہیں اور یہ سب لوگ جوق در جوق ''البیک'' کی طرف بھاگے جا رہے ہیں۔

ریحان نے گاڑی دوڑائی تو ہم نے خود کو لاہور کے گلبرگ جیسے ہرے بھرے علاقے میں پایا۔ سڑک کے دونوں طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ سردی بھی لگنے لگی تھی۔ میرے پوچھنے پر ریحان نے بتایا ''یہ طائف کو جانے والی سڑک ہے۔ طائف ایک ہرا بھرا پہاڑی علاقہ ہے۔ یہ مکّہ سے تقریباً چالیس کلومیٹر دور ہے۔ چونکہ طائف کا موسم خوشگوار رہتا ہے اس لیے مکّے اور گردونواح کے لوگ تفریح کے لیے طائف ہی جاتے ہیں۔ آبادی اس کی اتنی ہے جتنی لاہور کے کسی محلے کی ہو سکتی ہے یعنی چند لاکھ نفوس۔ طائف کا شہد اور انگور مشہور ہیں۔ ہمارے نبیؐ نے تبلیغ کے لیے طائف کا سفر کیا تھا لیکن طائف والوں نے آپؐ سے نہایت بُرا سلوک کیا تھا۔ آپؐ کو پتھر مارے گئے۔ آپؐ کو لہولہان کر دیا گیا تھا''۔

ریحان بولتا چلا جا رہا تھا لیکن اس سے آگے میں سننا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے بات بدلنے کے لیے کہا: ''وقت بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ آپ کا دوست عمرہ کر کے فارغ ہو چکا ہوگا۔ آئیے اب واپس چلتے ہیں''۔ اور ریحان نے یوٹرن لے لیا۔

جبلِ ثور کی چڑھائی

صبح کے تقریباً آٹھ بجے ریاض نامی ایک شخص کا فون آیا۔ کہنے لگا کہ میں توقیر احمد شریفی صاحب کی پاور کمپنی میں ڈرائیور ہوں۔ فی الوقت جدے میں ہوں اور دس بجے آپ کے ہوٹل کے باہر پہنچ جاؤں گا۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ آپ کو مکّے کے مقدس مقامات پر لے جاؤں۔ یہ وہی شریفی صاحب ہیں جنھوں نے مدینے میں ہمارے لیے گاڑی بھیجی تھی اور ان کے آدمی نے مقاماتِ مقدس کی زیارت کرائی تھی۔

پورے دس بجے ریاض صاحب گاڑی لے کر آ گئے۔ گاڑی چونکہ بڑی تھی اس لیے ہم نے اکرام صاحب اور ان کی بیگم نگینہ کو بھی ساتھ لے لیا۔ اللہ کے مہمانوں کو شریفی صاحب نے اپنا مہمان بنا لیا تھا۔ ریاض صاحب سب سے پہلے ہمیں جبلِ ثور لے گئے۔ یہ پہاڑ مکّے سے تقریباً ساڑھے چار کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اور اس کی بلندی 4610 فٹ ہے۔ اسی پہاڑ میں وہ غار ہے جس میں ہمارے پیغمبر حضرت محمدؐ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ ہجرتِ مدینہ کے دوران میں تین دن اور تین رات قیام کیا تھا۔ اسی وجہ سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو یارِ غار بھی کہا جاتا ہے۔ اب تو یارِ غار ایک محاورے کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ ہم اپنے پرانے دوستوں کو یارِ غار کہتے ہیں۔

ہم چاروں نے اس پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا۔ میں اور شبنم تو خاصے اوپر تک چلے گئے لیکن اکرام صاحب اور نگینہ حوصلہ ہار گئے۔ مروتاً ساتھ نبھانے کے لیے ہم دونوں بھی نیچے آ گئے۔ ورنہ ہم دونوں غارِ ثور تک ضرور جاتے۔ بادلِ نخواستہ ہم ایک بار پھر گاڑی میں سوار ہو گئے۔

غارِ حرا کے اندر

ہم سب کی خواہش تھی کہ غارِ حرا ضرور جائیں گے۔ میرا خیال تھا کہ گاڑی ہمیں غارِ حرا تک لے جائے گی لیکن ڈرائیور نے ایک جگہ گاڑی روک کر کہا: "یہاں سے غارِ حرا تک پیدل جانا ہوگا"۔ اس نے انگلی سے ایک چوٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ رہا غارِ حرا۔ ادھر نظر ڈالی تو حیرتوں کا پہاڑ میرے اوپر آن گرا۔ غارِ حرا بہت بلندی پر تھا۔ کچھ لوگ پہاڑ کے عین درمیان بنے ہوئے راستے پر جاتے ہوئے دکھائی دیے۔ لگتا تھا چھوٹی چھوٹی چیونٹیاں چلی جا رہی ہیں۔ غارِ حرا، جبلِ نور کی چوٹی پر ہے اور یہ زمین سے تقریباً اڑھائی ہزار فٹ بلند ہے۔ میں اور شبنم تو غارِ حرا کی طرف چل دیے لیکن اکرام صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ گاڑی میں بیٹھے رہے۔ ان کی صحت اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ اتنی بلندی پر پیدل جائیں۔ ہم دونوں نے تو تہیہ کیا ہوا تھا کہ غارِ حرا تک ضرور جائیں گے اس لیے آگے بڑھتے گئے۔ سارا راستہ چڑھائی کا تھا۔ چند سو گز چلنے کے بعد ہم دونوں تھک گئے۔ راستے میں ایک "بقالہ" یعنی جنرل سٹور نظر آیا تو پانی کی دو بوتلیں خرید لیں۔ گرمی بھی زوروں پر تھی۔ میں اپنا ہیٹ لانا بھول گیا تھا اس لیے سورج سیدھا میرے سر پر حملہ آور ہو رہا تھا لیکن میں نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔ پہاڑ کے اوپر چلتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ ہمارے نبیؐ کس طرح غارِ حرا تک جاتے ہوں گے؟ وہ تو وہاں بار بار تشریف لے جاتے تھے اور جبریل علیہ السلام سے ہم کلام ہوتے تھے۔ میں نے کچھ اوپر جا کر دیکھا تو شبنم بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ وہ ایک پتھر پر بیٹھی بوتل کو منہ لگائے پانی پی رہی تھی۔ میں نے بھی بوتل کھولی ایک گھونٹ پانی پیا اور چل دیا۔ کچھ لوگ اوپر سے نیچے کی طرف آتے دکھائی دیے۔ سب نے یہ کہہ کر ڈرانے کی کوشش کی کہ غارِ حرا بہت دور ہے۔ لیکن میں انھیں کہتا کہ پاکستان سے اگر یہاں تک آ گیا ہوں تو غارِ حرا کے اندر بھی ضرور جاؤں گا۔ کچھ اور اوپر جا کر مڑ کر دیکھا تو شبنم کہیں نظر نہ آئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ شاید واپس چلی گئی ہے۔ چلتے چلتے کئی بار میری سانس پُھولی۔ راستے میں کے کناروں پر پاکستانی فقیروں نے ڈیرے جما رکھے تھے۔ میں ان کی گدڑی پر لیٹ جاتا اور تھوڑا سا ستا کر پھر چل پڑتا۔ آدھے راستے میں پہنچا تو میں نے ایک بار پھر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ شبنم تو کہیں نظر نہ آئی البتہ پہاڑ کے اوپر چند بکریاں چرتی ہوئی نظر آئیں۔ یہ منظر مجھے چودہ سو سال پیچھے لے گیا۔ اس منظر نے مجھے مبہوت کر دیا تھا۔ پہاڑ یہی تھا لیکن اب نہ وہ چرواہا تھا نہ بکریاں۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر اس پہاڑ کو زبان عطا ہو جائے تو اس پیکرِ رحمت کی سیرت کے کتنے ان کہے واقعات سننے کو ملیں۔ عشق اور عقیدت

تخیل کو کہاں کہاں لے جاتے ہیں؟

اسی طرح گرتے پڑتے لڑکھڑاتے اور ڈگمگاتے ہوئے میں بالآخر جبلِ نور کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر پتا چلا کہ غارِ حرا میں جانے کے لیے اب پہاڑی کے عقبی حصے میں کچھ نیچے اترنا ہوگا۔ چنانچہ میں سانس لینے کے لیے وہیں کچھ دیر رُک گیا۔ جبلِ نور کی چوٹی پر بھی ایک ''بقالہ'' تھا جہاں کولڈ ڈرنکس اور کھانے پینے کی اشیا نسبتاً مہنگے داموں فروخت ہو رہی تھیں۔ اتنے بلند اور خشک پہاڑ کی چوٹی پر ان اشیاء کا میسر آ جانا بھی غنیمت تھا۔ چنانچہ میں پانی کی ایک اور بوتل خریدنے کے لیے کاؤنٹر کی طرف گیا۔ اتنے میں مجھے اپنے پیچھے سے آواز آئی: ''اُجلی کے بابا''! یہ شبنم تھی جو پتا نہیں کس طرح اوپر آ گئی تھی۔ میں اس کی ہمت پر دل ہی دل میں داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے جلدی سے پانی کی دو بوتلیں خریدیں اور دونوں نے وہیں زمین پر بیٹھ کر کچھ پانی پیا۔ چند لمحے سستا کر غارِ حرا میں جانے کے لیے پہاڑ سے نیچے اترے تو ایک تنگ سا دہانہ دکھائی دیا۔ یہی غارِ حرا کے اندر جانے کا راستہ تھا۔ اس تنگ دہانے سے مجھ ایسے دھان پان شخص کا گزرنا بھی محال لگتا تھا لیکن یہ ایک معجزہ ہی تھا کہ وہاں سے بھاری بھرکم مرد و خواتین بہت سہولت کے ساتھ آ جا رہے تھے۔ مجھے پہلے تو ڈر لگا لیکن جب میں اس تنگ دہانے میں داخل ہوا تو آسانی سے گزر گیا۔ غارِ حرا کے سامنے عورتوں اور مردوں کی چھوٹی چھوٹی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ ہر ایک کی خواہش تھی کہ غار کے اندر دو نفل ادا کرے۔ نماز کے اندر ایک مصلیٰ بچھا ہوا تھا۔ میں نے وہاں موجود لوگوں سے درخواست کر کے شبنم کو باری سے پہلے غار کے اندر بھیج دیا اور خود قریب ہی کھڑے ہو کر لوگوں کے ذوق و شوق کا مشاہدہ کرتا رہا۔ حیران کن بات یہ تھی کہ وہاں کئی بوڑھے مرد اور خواتین بھی آئے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ ننھے بچے بھی تھے۔ بوڑھوں کی ہمت اور حوصلے کی داد نہ دینا بخیلی ہوگی۔ وہاں موجود زیادہ لوگ پاکستانی تھے۔ اس لیے جب شبنم غارِ حرا میں نفل ادا کر رہی تھی، میں نے وہاں موجود لوگوں کو اپنی نعت کے اشعار سنانا شروع کر دیے۔ واہ واہ اور سبحان اللہ! سبحان اللہ! کی صداؤں نے مجھے مخمور اور مسحور کر دیا تھا:

کعبے میں کھڑے ہو کے محمدؐ کو کروں یاد
مکّے میں مدینے کا مزہ اور ہی کچھ ہے

رُخصت کا وقت آیا ہے، زادِ سفر اُٹھا!

میدانِ عرفات

غارِ حرا دیکھنے کے بعد جبلِ نور سے اترتے ہوئے ہم دونوں اتنے سرشار تھے کہ ہمیں یہ دھیان بھی نہ رہا کہ ذرا سا پاؤں پھسلا تو ہم سینکڑوں فٹ نیچے جا گریں گے۔ ہمیں پورا یقین تھا کہ ہم جس کے مہمان ہیں وہ ہمیں گرنے نہیں دے گا۔ گریں گے تو بازو سے تھام لے گا۔ پہاڑ سے نیچے اترتے ہوئے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بہت سے لوگ ملے جو تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ غارِ حرا کی طرف رواں دواں تھے۔ مجھ سے جس نے بھی غارِ حرا کے فاصلے کے بارے میں پوچھا میں نے اسے یہی جواب دیا کہ بس تھوڑے ہی فاصلے پر ہے۔ میں کسی کی دل شکنی کر کے اس کے شوقِ سفر کو ختم نہیں کرنا چاہتا تھا، جس طرح کچھ لوگوں نے میرے ساتھ کیا تھا۔ ہم ہَوا کا ہاتھ تھامے چند ہی لمحوں میں اپنی گاڑی کے پاس پہنچ گئے۔ اکرام صاحب اور نگینہ بے تابی سے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔

یہاں سے نکلے تو ہم میدانِ عرفات میں جا پہنچے۔ عرفات کی پہاڑی کی چوٹی پر سیکڑوں لوگ کھڑے تھے۔ اس پہاڑی پر چڑھنے کے لیے ویسے تو ایک جانب سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں، لیکن اہلِ شوق کی بہت بڑی تعداد اونچے نیچے پتھروں پر پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے بلندی تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ کوشش کسی نقصان کا باعث بھی ہو سکتی تھی لیکن اللہ اور نبی ؐ کی نگری میں نقصان کی کسے پروا تھی۔ سو ہم دونوں نے بھی چوٹی تک پہنچنے کے لیے یہی راستہ اپنایا۔ چونکہ چلنے کے لیے ہم نے کوئی متعین راستہ نہیں چنا تھا اس لیے کبھی ایک دوسرے کے بہت قریب آ جاتے اور کبھی بہت دور ہو جاتے۔ کبھی ہاتھ تھام کر ایک دوسرے کو سہارا دیتے اور کبھی ایک دوسرے کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے۔ بالآخر ہم عرفات کی چوٹی پر پہنچ ہی گئے۔ لیکن یہاں پہنچ کر پتا چلا کہ سیڑھیوں کے راستے ابھی ہمیں تھوڑا اور چلنا ہے۔ ان سیڑھیوں پر ایک تو زائرین کرام کا ہجوم تھا دوسرے یہ کہ قدم قدم پر بیماروں اور معذوروں کا روپ دھارے گداگر پڑے ہوئے تھے۔ ان گداگروں میں بچے بھی تھے۔ میں حیران تھا کہ یہ بیمار اور معذور اتنی بلندی پر کس طرح پہنچ گئے؟ اس سوال کا جواب مجھے تب ملا جب میں نے ان گداگروں کی تصویریں بنانا شروع کیں۔ برقع پوش حبشی خواتین شور مچاتے ہوئے میرے قریب آئیں اور مجھے تصویریں اتارنے سے منع کرنے لگیں۔ حتیٰ کہ گداگر بھی اپنے چہرے چھپانے لگے۔ زائرین کے ہجوم اور گرم پتھروں پر کوٹتے ہوئے گداگروں سے بچتے بچاتے ہم چوٹی پر پہنچے تو وہاں بہت سے لوگ نماز ادا کرتے دکھائی دیے۔

عرفات کی یہ پہاڑی مکہ مکرمہ سے تقریباً سولہ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہ پہاڑی ہلکے سبزی مائل بڑے اور چھوٹے گول اور بیضوی پتھروں سے بنی ہوئی ہے۔ اس کی مٹی بھربھری ہے۔ اس پہاڑی کو جبلِ عرفہ اور جبلِ رحمت کا نام دیا گیا ہے۔ زمین سے یہ تقریباً

ساٹھ میٹر بلند ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام اور اماں حوّا کو زمین پر اتارا گیا تو حضرت آدم سری لنکا میں تھے اور اماں حوّا سعودیہ کی سرزمین جدّے پر تھیں۔ جب دونوں ایک دوسرے کی تلاش میں نکلے تو ان کی ملاقات، اسی پہاڑی پر ہوئی تھی اور اسی لیے اسے جبلِ رحمت کہا جاتا ہے۔ عرفہ کے معنی جاننے اور پہچاننے کے بھی ہیں۔ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے مناسک حج سے روشناس کرایا تھا۔ شاید اسی لیے اسے جبلِ عرفہ کہا جاتا ہو۔ یہ پہاڑی ایک بہت بڑے میدان میں ہے اور اس میدان کو، میدانِ عرفات کہا جاتا ہے۔ یہ میدان تقریباً دس میل لمبا اور اتنا ہی چوڑا ہے۔ اس میدان میں حج کا لازمی رکن وقوف ادا کیا جاتا ہے۔ یہاں اپنے قارئین کو ایک دلچسپ واقعہ سناتا چلوں۔ میں 1995ء میں پنجاب پبلک سروس کمیشن میں اردو کی لیکچرر شپ کے لیے انٹرویو دینے گیا تو انٹرویو لینے والی ٹیم کے ایک رکن نے مجھ سے پوچھا: "بتایئے میدانِ عرفات میں کیا ہوتا ہے"؟ تب مجھے علم نہیں تھا کہ اس میدان میں حج کا کون سا رکن ادا کیا جاتا ہے، البتہ اتنا میں جانتا تھا کہ حج کرنے والے تمام لوگ میدانِ عرفات میں ضرور جاتے ہیں۔ اس لیے سوال پوچھنے والے فاضل رکن کو میں نے جواب دیا: "سر! میں نے ابھی حج نہیں کیا"۔ میرا جواب سن کر وہ بولے: "یہ تو کوئی جواب نہ ہُوا"۔ اسی پینل میں ایک اور صاحب بھی بیٹھے ہوئے تھے جو میری غزلوں کا مجموعہ "منظر بدل گئے" دیکھ چکے تھے۔ انھوں نے شاعر نوازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا: "سر! اس نوجوان نے آدھا جواب دے دیا ہے"۔ ان کی یہ بات سن کر سوال پوچھنے والے فاضل رکن دھیرے سے مسکرا دیے۔

عمرہ بھی حج ہی کے برابر ہوتا ہے اس لیے اب مجھے پتا چل گیا کہ میدانِ عرفات میں کیا ہوتا ہے؟ لیکن میں اگر کبھی پنجاب پبلک سروس کمیشن میں اردو کی لیکچرر شپ کے امیدواروں سے انٹرویو لینے گیا تو ان سے اردو زبان وادب سے متعلق سوال ہی پوچھوں گا۔

ہم واپسی پر مسجدِ نمرہ بھی گئے لیکن اندر جانے کی اجازت نہ مل سکی۔ غالباً بند تھی۔ دھوپ نے بھی شوق کے طوفان پر بند باندھ دیا تھا۔ دھوپ اتنی تیز تھی کہ میرے سر میں شدید درد ہونے لگا تھا۔ یہ وہی درد ہے جو مجھے کم از کم چار یا پانچ دن جکڑے رہتا ہے اور کسی دوا سے فرو نہیں ہوتا۔ میں جتنی بھی دوائیں کھالوں۔ یہ اپنے وقت پر آپ ہی ٹھیک ہوتا ہے۔ اس کا ایک ہی علاج ہے کہ اسے برداشت کیا جائے۔

ہمارا ڈرائیور گاڑی بھگاتا اور ہمیں ہماری مطلوبہ جگہ پر پہنچا کر بریک پر پاؤں رکھ دیتا اور خود اپنے مہنگے موبائل سے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اس مقام کی تصویریں بناتا جو وہ ہمیں دکھانے لاتا تھا۔ انٹرنیٹ کے ذریعے اسی وقت لاہور میں موجود اپنے اہلِ خانہ کو بھیج دیتا اور ساتھ ہی ساتھ فون پر انھیں اس مقام کی مذہبی اور تاریخی اہمیت سے بھی آگاہ کرتا رہتا۔ گویا وہ ہمیں بالواسطہ معلومات فراہم کر رہا تھا۔ آخر کار مجھ سے نہ رہا گیا۔ بولا: "یہ بتائیں کہ آپ زیارات کے لیے ہمیں لائے ہیں یا لاہور میں موجود اپنے اہلِ خانہ کو"؟ میرے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر اس نے اپنا فون بند کیا اور جیب میں رکھ لیا۔ اس کے بعد راستے میں آنے والے تمام اہم مقامات کے بارے میں وہ ہمیں بتاتا رہا۔ ایک جگہ پہنچ کر بولا کہ اگر اس جگہ سے عازمینِ حج ایک قدم بھی آگے آ جائیں تو ان کا حج نہیں ہوتا۔ اس نے ہمیں عازمینِ حج کے لیے لگائے گئے مستقل خیمے بھی دکھائے۔ مسجدِ عائشہؓ بھی دکھائی لیکن دور دور سے۔ واپسی پر تو اس نے کمال ہی کر دیا۔ ایک بڑے سٹور پر گاڑی روکی۔ ہم چاروں کے لیے آئس کریم، سافٹ ڈرنک کے ٹین پیک، چاکلیٹ اور چیونگم خریدے۔ میرے لیے بطور خاص سعودی عرب میں فروخت ہونے والے گولڈ لیف سگریٹ کے کچھ پیکٹ خریدے۔ پہلے میں سمجھا کہ شاید اس نے اللہ کے مہمانوں کو اپنا مہمان بنا لیا ہے لیکن جب اس نے سٹور کے مالک سے خریدے گئے تمام سامان کی رسید بنوائی تو میں سمجھ گیا کہ یہ سارے اخراجات

شریفی صاحب کی کمپنی کے کھاتے میں ڈالے جائیں گے۔

ایمان کا معجزہ

ہوٹل میں پہنچا تو احساس ہوا کہ سر کا درد مزید بڑھ گیا ہے۔اب مجھے فکر لاحق ہوئی کہ کیا بنے گا؟ اگلے روز پاکستان واپسی تھی۔اگر یہ درد اسی طرح سر پر سوار رہا ہو تو سفر مشکل ہو جائے گا۔دو جہاز بدل کر لاہور پہنچنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔اتنے میں مجھے اپنے والد صاحب کی بات یاد آ گئی۔انھوں نے پاکستان سے فون کر کے خاص طور پر مجھے کہا تھا کہ اپنے سر پر آبِ زم زم لگاتے رہنا۔درد ختم ہو جائے گا۔چنانچہ میں نے کمرے میں پڑے ہوئے چھوٹے سے فریج سے آبِ زم زم کی بوتل نکالی۔کچھ سر پر لگایا کچھ پی لیا۔جب سر کی جلد پر ٹھنڈا آبِ زم زم لگا تو مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے سر پر ہلکا پھلکا برفانی تودا رکھ دیا ہے۔ٹھنڈک روح میں اترتی چلی گئی۔اس ٹھنڈک کا لطف لینے اور تھکاوٹ کا احساس ختم کرنے کے لیے میں بستر پر دراز ہو گیا۔تقریباً ایک گھنٹے کے بعد آنکھ کھلی تو سر کا درد غائب تھا۔یہ معجزہ یہیں دیکھا۔ورنہ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ نیند پوری نہ ہو تو درد میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔میں اسے آبِ زم زم کا معجزہ سمجھتا ہوں۔اس کا ذکر میں نے شبنم سے کیا اور شبنم نے نگینہ کو بتایا۔نگینہ نے اپنے میاں اکرام کو بتایا۔بس پھر کیا تھا۔گویا چمن میں دبستاں کُھل گیا۔سب آبِ زم زم سے متعلق اپنے اپنے تجربات بیان کرنے لگے۔بالآخر بات وہیں ختم ہوئی کہ ایمان اور یقین سے سب کچھ ممکن ہے۔

’’جمعتہ الوداع‘‘

اگلے روز جمعہ تھا۔یہ ہماری واپسی کا دن تھا۔اس لیے ہم دونوں صبح ہی صبح حرم شریف پہنچ گئے اور طواف وداع کرنے کے بعد بابِ ملک فہد سے گزر کر باہر آ گئے۔طوافِ وداع کا تعلق اگرچہ حج سے ہے لیکن عمرہ کرنے والے بھی عام طور پر طوافِ وداع کرتے ہیں۔

تھوڑی دیر اپنے کمرے میں آرام کیا۔ساڑھے گیارہ بجے نمازِ جمعہ ادا کرنے کے لیے ایک بار پھر حرم شریف کی طرف چل دیے۔اتنا ہجوم میں نے وہاں پہلی بار دیکھا۔چلنا مشکل ہو رہا تھا۔کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔حج کے دنوں میں تو اس سے بھی زیادہ لوگ ہوتے ہیں۔تب کیا بنتا ہو گا؟ میں یہ سوچ کر کانپ کر رہ گیا۔مکے میں قیام کے دوران میں پہلی بار ہُوا کہ ہم بابِ ملک فہد سے اندر داخل نہ ہو سکے۔پولیس اور دوسرے محافظوں نے ہر دروازے پر قبضہ کر رکھا تھا۔انھوں نے اپنے بازوؤں سے ایک زنجیر بنا رکھی تھی اور کسی کو آگے جانے نہیں دے رہے تھے۔پوچھنے پر پتا چلا کہ جن دروازوں سے داخلے سے روکا جا رہا ہے،حرم شریف کے ان حصوں میں نمازی پہلے ہی آ چکے ہیں۔ہمیں بالآخر بہت گھوم کر حرم شریف کے نوتعمیر شدہ حصے میں داخلے کی اجازت ملی۔یہاں ہم پہلی بار آئے تھے۔ہجوم یہاں بھی کم نہ تھا۔دراصل جمعہ کے دن یہاں ہمیشہ اسی طرح ہجوم ہوتا ہے لیکن ہم نے چونکہ اپنا پہلا جمعہ مسجدِ نبویؐ میں پڑھا تھا۔اس لیے اس اوپن سیکرٹ کی خبر ہمیں نہ ہو سکی۔امام صاحب نے عربی زبان میں مختصر سا خطبہ دیا اور نماز پڑھائی۔اتنی مختصر نمازِ جمعہ، میں نے یہیں پڑھی۔اچھا ہی ہوا کیونکہ دو بجے ہماری بس ہمیں جدے ائرپورٹ لے جانے کے لیے آنے والی تھی۔جمعتہ الوداع کی اصطلاح اگرچہ رمضان المبارک کے آخری جمعے کے لیے استعمال ہوتی ہے لیکن ہمارے لیے یہ دن بھی جمعتہ الوداع ہی تھا۔

خالق سے دُعا ہے کہ میں اندر سے بدل جاؤں

شبنمی آنسو

نماز جمعہ کے بعد ہم شارع ابراہیم خلیل کے دونوں اطراف میں واقع دکانوں اور عمارتوں پر الوداعی نظر ڈالتے ہوئے اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے۔ ہماری بس ہمیں جدہ ایئرپورٹ تک لے جانے کیلئے تیار کھڑی تھی۔ میں نے سوچا کہ سفر پر روانہ ہونے سے پہلے بھارتیوں کے پاکستانی ہوٹل سے کھانا کھالیا جائے۔ نماز کے وقفے کے بعد ہوٹل کھل چکا تھا۔ نماز کے بعد جب ہوٹل کھلتے ہیں تو یک دم رش لگ جاتا ہے۔ سو اس وقت بھی ایسا ہی تھا لیکن جلد ہی ہمیں خالی میز کرسی مل گئی۔ ہم نے جلدی جلدی ندیدوں کی طرح کھانا کھایا اور اپنے ہوٹل کے کمرے میں آ گئے' جہاں ہمارا بندھا ہوا سامان رکھا تھا۔ وزن چونکہ بہت زیادہ تھا اس لیے ایک بار پھر ہوٹل کا بنگالی ویٹر کام آیا۔ اس نے نہایت پھرتی سے ہمارا سامان بس میں رکھوا دیا۔ جب ہم بس میں اپنا سامان رکھوا رہے تھے' مدینے سے آنے والی ایک بس وہاں آ کر رکی۔ اس بس میں سے بابا بشیر برآمد ہوئے تو دل کو تسلی ہوئی کہ یہاں کوئی ہمیں الوداع کہنے والا بھی موجود ہے۔ اکرام اور نگینہ کہیں گئے ہوئے تھے۔ میں نے بابا بشیر سے معانقہ کیا اور شبنم اماں رشیدہ اور شازیہ سے گلے ملی۔ ہمارا یہ معانقہ استقبالی بھی تھا اور الوداعی بھی۔ بابا بشیر کی فیملی کیلئے استقبالی اور ہمارے لیے الوداعی۔

بس میں ہمیں حسبِ خواہش سب سے اگلی نشستیں ملیں۔ جب تمام مسافر بیٹھ گئے تو ڈرائیور نے ہر آدمی کو اس کا پاسپورٹ واپس کیا۔ یہ پاسپورٹ عمرہ کمپنی کے نمائندے نے پہلے ہی دن جدہ پہنچنے پر ہم سے لے لیے تھے اور کہا تھا کہ واپسی پر ملیں گے۔ بس میں موجود ایک صاحب کا پاسپورٹ غائب تھا۔ نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ ڈرائیور نے کمپنی کے دفتر میں فون کر کے اس معاملے کی اطلاع دی۔ عین روانگی کے دن پاسپورٹ گم ہو جائے تو بہت مشکل پیدا ہو جاتی ہے۔ ہم تمام لوگ ان صاحب کی پریشانی سمجھ سکتے تھے اس لیے کسی شخص نے ڈرائیور سے یہ نہیں کہا کہ انھیں یہیں اتار دو اور باقیوں کو جدہ ایئرپورٹ اتار آؤ۔ ویسے بھی پرواز کا وقت ابھی نہیں ہوا تھا لیکن پرواز سے تین گھنٹے پہلے پہنچنا ضروری تھا۔ تقریباً دو گھنٹے کی کوشش کے بعد ان صاحب کا پاسپورٹ عمرہ کمپنی کے کسی کونے کھدرے سے مل گیا اور ہماری بس جدے کی طرف روانہ ہوئی۔

جب تک بس کھڑی رہی ہم خوش تھے لیکن جونہی بس چلی' دل بھر آیا۔ رونے کو جی چاہتا تھا لیکن ضبط کیا۔ میں نے شبنم کی طرف دیکھا تو وہ دوپٹے میں منہ چھپائے رو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ میں اس کے بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ سکتا تھا لیکن روک نہیں سکتا تھا۔ میں نے اسے جان بوجھ کر رونے دیا۔ شبنم کے آنسو مجھے اپنے لگ رہے تھے' سو وہ روتی رہی' میں دیکھتا رہا۔

ہماری بس اگرچہ کھٹارا سی تھی لیکن اس کے طور اطوار ہماری سڑکوں پر دوڑنے والے

''وڑانچ طیارے'' جیسے تھے۔ بس اُڑی جا رہی تھی۔ ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد ایک سنگ میل پر جدہ پانچ کلومیٹر لکھا نظر آیا۔ یہ سنگِ میل شاید ہم مسافروں کو مطمئن کرنے کیلئے لگایا گیا تھا کیونکہ اس سنگ میل کو عبور کرنے کے بعد بھی ہماری بس لمبی لمبی سڑکوں پر ایک گھنٹے تک دوڑتی رہی۔ بتایا گیا کہ جدے کے تین ایئرپورٹ ہیں اور ان کے درمیان خاصا فاصلہ ہے۔ کچھ مسافروں کو راستے میں آنے والے پہلے ایئرپورٹ پر سامان سمیت اتارا گیا۔ ہمارا ایئرپورٹ سب سے آخر میں آیا۔ ڈرائیور سامان اتارنے کے لیے بس کی چھت پر چڑھ گیا۔ اس بس میں بظاہر سب سے کم عمر اور نوجوان میں تھا اس لیے ڈرائیور بس کی چھت سے تمام مسافروں کا سامان باری باری مجھے پکڑاتا گیا اور میں نیچے رکھتا رہا۔ قریب ہی ٹرالیاں موجود تھیں لیکن میں نے ایک پورٹر کو بلایا۔ وہ ٹرالی لے کر بھاگ کر میرے پاس آیا۔ اس کی یونیفارم پر جلی حروف میں لکھا تھا 10 ریال۔ لیکن مجھ سے اس نے 20 ریال طلب کیے۔ پورٹر چونکہ پاکستانی تھا اور مجھ سے اس نے اردو میں بات کی تھی اس لیے میں نے پاکستان نوازی اور اردو دوستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے 20 ریال ہی دیے۔ اس نے ہمارا سامان بورڈنگ کاؤنٹر کے سامنے جا اتارا۔ سعودی ایئر لائنز میں چونکہ اکانومی کلاس کے ایک ٹکٹ پر تئیس، تئیس کلو کے دو بیگ ساتھ لے جانے کی اجازت ہے لیکن ہم نے چوبیس چوبیس کلو کے چار بیگ بنا لیے تھے اور ان پر احتیاطاً لیمی نیشن بھی کروالی تھی۔ میں نے ہر بیگ میں ایک ایک کلو زیادہ سامان رکھا تھا۔ وہ پاکستانی ہی کیا جو قانون قاعدے کی تھوڑی بہت خلاف ورزی نہ کرے۔ جب ہمارے سامان کا وزن کیا گیا تو بورڈنگ کارڈ جاری کرنے والے سوٹڈ بوٹڈ نوجوان نے اپنے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا دکھا کر مجھے داد دی کیونکہ مجھ سے آگے کھڑے مسافر کے پاس ایک ہی بیگ تھا اور اس کا وزن تقریباً 46 کلو تھا چنانچہ اس نے اس کا سارا سامان وہیں کھلوا لیا تھا اور اسے ہدایت کی تھی کہ تئیس تئیس کلو کے دو بیگ بنائے۔ ریحان چشتی کیلئے دل سے دعا نکلی جس نے مجھے سعودی ایئر لائنز کی بیگیج پالیسی سے پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔

مسافر نوازی

سامان بک کرانے اور بورڈنگ کارڈ لینے کے بعد لاؤنج میں داخل ہونا تھا اور اس کے لیے تلاشی ضروری تھی۔ اس مرحلے سے ہم دونوں بخیریت گزر گئے لیکن شبنم کے دستی سامان سے تلاشی لینے والوں نے کچھ سامان بحق سرکار ضبط کر لیا تھا۔ ضبط ہونے والے سامان میں ایک امپورٹڈ ٹیپ تھی جو ریحان ہمارا سامان پیک کرنے کے لیے لایا تھا۔ یہ ٹیپ مضبوط تھی اور چوڑی بھی۔ اہل کار کا کہنا تھا کہ اس ٹیپ سے آپ ہوائی جہاز میں کسی کے گلے میں پھندا ڈال سکتے ہیں، اس لیے یہ اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ دوسری چیز لوہے کا چھوٹا سا ترازو تھا جسے ایک ہاتھ میں تھام کر آپ آسانی سے بیس کلو تک سامان تول سکتے ہیں۔ ان کے خیال میں اسے بھی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال ہم تو سعودی عرب سے انصاف کی علامت اپنے ساتھ پاکستان لانا چاہتے تھے لیکن یہ ایئرپورٹ حکام کی انصاف پسندی کی نذر ہو گئی۔ شبنم کے بیگ میں کچھ دوائیں اور انجکشن بھی تھے۔ وہ انھوں نے اسی کے پاس رہنے دیے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وہاں میڈیکل سٹور سے دوائیں ڈاکٹری نسخے کے بغیر نہیں ملتیں لیکن میرا تجربہ کچھ مختلف ہے۔ میں نے پیناڈول کے پتے اور نیوروبیان انجکشن بغیر ڈاکٹری نسخے کے خریدے۔ اب یہ مجھے معلوم نہیں کہ جرم میں نے کیا یا میڈیکل سٹور والے نے؟ کم از کم میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ میڈیکل سٹور والے نے مسافر نوازی کا مظاہرہ کیا۔

ہماری پرواز مقامی تھی۔ اسے جدے سے ریاض تک جانا تھا اور ابھی اس کی روانگی میں تین گھنٹے باقی تھے۔ جدے کا ایئرپورٹ انتہائی ماڈرن تھا۔ ہم دونوں ایک کونے میں

دبک کر بیٹھ گئے' بھوک لگ رہی تھی۔ شبنم نے سگھڑ پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے ''البیک'' کا بچا ہوا کھانا ساتھ رکھ لیا تھا چنانچہ ہم دونوں لوگوں کی نظریں بچا کر جلدی جلدی پینڈوؤں کی طرح کھانے لگے۔

جہاز کی روانگی کا اعلان ہوا تو ہم نے اپنا دستی سامان سمیٹا اور قطار میں لگ کر جہاز کے اندر جا پہنچے۔ یہ لوکل فلائٹ تھی لیکن جہاز انٹرنیشنل تھا۔ بالکل ویسا جیسا ہمیں لاہور سے جدہ لایا تھا۔ ایک گھنٹے میں ہم ریاض پہنچ گئے۔ ریاض پہنچے تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ ریاض سے صبح سات بجے ہماری پرواز تھی جس کے ذریعے ہمیں لاہور پہنچنا تھا۔ ریاض ایئرپورٹ کی وسعت اور خوب صورتی کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ سامان سے لدی ہوئی دکانیں اپنی طرف کھینچتی ہیں لیکن چیزوں کی قیمتیں آپ کو وہاں کھڑا نہیں ہونے دیتیں۔ چیز دیکھیے' قیمت پوچھیے اور کسی کونے میں جا کر اپنے آنسو پونچھیے۔ ایک کافی شاپ سے کافی کا ایک کپ لیا اور ہم دونوں نے پیا۔ رات بھر جاگنا بھی تو تھا۔ کافی پینے کے باوجود شبنم سونا چاہتی تھی اس لیے میں نے اسے سامان کے پاس چھوڑا اور میں ایئرپورٹ کے مختلف حصوں میں گھومنے لگا۔ ایئرپورٹ کی حدود میں ہوائی جہاز یوں کھڑے تھے جیسے ہمارے ہاں لاری اڈے پر چھوٹے روٹوں کی بسیں کھڑی ہوتی ہیں۔

تبدیلی کا سفر

میری بے چین طبیعت مجھے ایئرپورٹ پر اِدھر اُدھر لیے پھرتی رہی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ صبح کے تقریباً ساڑھے پانچ بجے مجھے ایک کمرا مل گیا جو سگریٹ پینے والوں کے لیے خاص طور پر بنایا گیا تھا۔ نہایت خوب صورت کرسیاں وہاں پڑی تھیں۔ میز پر بیش قیمت ایش ٹریز پڑی ہوئی تھیں۔ ہر ایش ٹرے بجھے ہوئے سگریٹوں اور راکھ سے اٹی ہوئی تھی۔ لگتا تھا کہ رات بھر یہاں کوئی محفل جمی رہی ہے اور لوگ ابھی اٹھ کر یہاں سے گئے ہیں:

تری صبح کہ رہی ہے تری رات کا فسانہ

ابھی میں نے سگریٹ سلگایا ہی تھا کہ دو نوجوان خواتین ہاتھوں میں سگریٹ کی ڈبیاں تھامے اندر داخل ہوئیں۔ دونوں کو اللہ تعالیٰ نے حسن کی دولت سے نوازا تھا۔ دونوں میرے سامنے بیٹھ گئیں اور نہایت اطمینان سے اپنی اپنی ڈبی سے سگریٹ نکال کر پینے لگیں۔ یہ منظر میرے لیے حیران کن تھا۔ انھیں جیسے خبر ہی نہ تھی کہ یہاں ان کے علاوہ بھی کوئی بیٹھا ہے۔ وہ دھواں اُڑاتی رہیں اور میں انھیں دیکھتا رہا۔ غالباً دونوں کسی عرب ملک کی ایئرلائن کی ہوسٹس تھیں اور رات بھر کی تھکن، سگریٹ کے دھویں میں اُڑا رہی تھیں۔ چند لمحے تو میں انھیں دیکھتا رہا لیکن پھر میرے دل میں ایک وہم آیا اور میں جلدی سے اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔

شبنم کے پاس پہنچا تو وہ میری منتظر تھی۔ اتنے میں ہماری پرواز کی روانگی کے لیے تیار ہونے کا اعلان ہو گیا۔ ہم جلدی سے قطار میں لگ کر جہاز میں پہنچ گئے۔ جہاز نے اُڑان بھری تو میرے دل نے بھی اُڑان بھری۔ میں خود کو پاکستان میں محسوس کر رہا تھا۔ مجھے ہلال جعفری کا یہ شعر یاد آ گیا:

جب لوٹ کے آؤں گا مدینے کے سفر سے
میں کیسا لگوں گا مرا گھر کیسا لگے گا

میرا جی چاہتا تھا کہ میرے سامنے اس وقت بہت بڑا آئینہ ہو اور اس کے سامنے کھڑا ہو کے دیکھوں کہ اس منصفِ اکبر کی عدالتِ اکبر میں پیشی کے بعد مجھ میں کیا تبدیلی آئی ہے؟ پھر یہ سوچ کر دل کو تسلی دی کہ تبدیلی تو وہ ہوتی ہے جو آپ کے اندر سے پھوٹتی ہے۔ ظاہری تبدیلی تو بہروپیوں کا کھیل ہے۔

خدا کے گھر سے مسافر پھر اپنے گھر آیا

گھر پیارا گھر

واپسی کے اس سفر میں مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے جہاز کے ساتھ ساتھ میں بھی محو پرواز ہوں۔ گویا رفتار دوگنا ہوگئی تھی لیکن اس کے باوجود فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ لاہور ایئرپورٹ پر ہمارے استقبال کے لیے کوئی بھی آنے والا نہیں تھا۔ اجالا' احسن' جواد اور ارفع اپنے دادا' دادی کے پاس ملتان گئے ہوئے تھے۔ فیصل آباد میں مقیم میرا بھائی طاہر ہمیں لینے کے لیے ایئرپورٹ پر آنا چاہتا تھا لیکن میں نے منع کر دیا۔ جہاز لاہور کی فضاؤں میں پہنچا تو میں کھڑکی سے جھانک کر بار بار باہر دیکھتا تھا' سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا میں چھوڑ کر گیا تھا۔ اگر کچھ بدلا تھا تو وہ میں تھا۔ جہاز نے لینڈ کیا تو ہر آدمی کی خواہش تھی کہ سب سے پہلے بس وہی جہاز سے باہر نکلے۔ امیگریشن کی مہر لگوا کر پاسپورٹ سنبھالے ہم اپنا سامان حاصل کرنے کے لیے بیگج لاؤنج میں آئے۔ ہم چونکہ سعودی عرب سے دو جہاز بدل کر آئے تھے اس لیے خدشہ تھا کہ کہیں ہمارا سامان جدہ یا ریاض ہی میں نہ رہ گیا ہو۔ کم از کم اخبارات میں چھپنے والی خبروں سے تو یہی تاثر ملتا ہے کہ ہر عمرہ زائر یا حاجی کا سامان کھو جاتا ہے لیکن ہمارے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ سامان آسانی سے مل گیا حتیٰ کہ آبِ زم زم کی دو بوتلیں بھی مل گئیں جن میں سے ایک پر میرا اور دوسری پر شبنم کا نام لکھا ہوا تھا۔ لاؤنج سے باہر آئے تو سیکڑوں لوگ ہاتھوں میں پھولوں کے ہار لے کر کھڑے تھے، یہ سب لوگ اپنے اپنے عزیزوں کے استقبال کے لیے آئے تھے۔ گلے ملتے' ہار پہناتے اور مبارکباد دیتے لوگوں کو دیکھ کر دل میں خیال آیا کہ کاش میرے گھر والے بھی ان میں شامل ہوتے۔ میرے اور شبنم کے والدین اور سارے رشتے دار چونکہ ملتان میں رہتے ہیں' اس لیے سب سے گلے ملنے' ہار پہننے اور مبارکباد وصول کرنے کے لیے ہم دونوں کو ایک رات لاہور میں گزار کر اگلے دن ملتان روانہ ہونا تھا۔

لاؤنج سے نکل کر ریڈیو کیب کاؤنٹر سے ٹیکسی کرائے پر لی۔ کرایہ پیشگی وصول کیا گیا اور اس کی باقاعدہ رسید دی گئی۔ رنگ روڈ سے ہوتے ہوئے ہم تقریباً آدھے گھنٹے میں سنت نگر پہنچ گئے جہاں ہمارا کرائے کا مکان ہمارا منتظر تھا۔ لیکن ٹیکسی سے اترتے ہی میں نے دیکھا کہ ہمارے مالک مکان اختر صدیق صاحب دروازے کے دونوں پٹ کھولے کھڑے تھے۔ ان کے چہرے پر خوشی کے تاثرات تھے۔ ان کی بیٹیاں بھی ہمیں خوش آمدید کہنے کے لیے کھڑی تھیں۔ اختر صدیق صاحب کو میرے بچے دادا ابو اور ان کی بیٹیوں کو پھوپھو کہہ کر پکارتے ہیں۔ ویسے بھی اختر صدیق صاحب نے ہمیں کبھی کرایہ دار ہونے کا احساس نہیں دلایا۔ اگر میں اپنے کسی دوست سے ان کا یہ کہہ کر ان کا تعارف کراؤں کہ میرے مالک مکان ہیں تو فوراً کہتے ہیں کہ نہیں جناب یہ مالک ہیں' میں تو ان کے ساتھ رہتا ہوں۔

پھولوں کی دید

اختر صاحب کی پوری فیملی نے جس محبت کے ساتھ ہمارا استقبال کیا' مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔انھوں نے ہمارے کھانے پینے کابندوبست کررکھا تھا۔اتنے میں شبنم کی سہیلیاں ہار لے کرآ گئیں۔کچھ ہمارے منع کرنے کے باوجودکھانااورچائے لے آئیں۔لاہور کا یہ پرانا محلّہ مجھے اپنی انھی روایات کی وجہ سے پسند ہے۔غم ہو یا خوشی،لوگ آپ کے ساتھ کھڑے ہوجاتے ہیں۔ہمیں محسوس ہی نہیں ہوا کہ ہم لاہور میں اکیلے ہیں۔خواتین شبنم سےتو مل ہی رہی تھیں مجھے بھی یوں مل رہی تھیں جیسے میں ان کے گھر ہی کافرد ہوں۔سب ہم سے کرید کرید کرسوالات کر رہی تھیں۔وہ ہم سے اس مقدس سفر کی روداد سننا چاہتی تھیں۔اس سفر کا کچھ احوال انھیں سنایا تو ان کی آنکھوں میں حیرت ناچنے لگتی۔بس تبھی میں نے سوچ لیا تھا کہ اس سفری احوال کوتفصیل سےلکھوں گا۔

شبنم سےملاقات کے لیےشام تک جتنی بھی خواتین آئیں سب نے ہم دونوں سے اپنے حق میں دعا کرنے کے لیے کہا۔انھی خواتین نے بتایا کہ عمرہ کرکےواپس آنے والے لوگ کم ازکم چالیس دن حالت عمرہ ہی میں رہتے ہیں اوران کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔گویا میں چالیس دنوں کیلئے پیر بن گیا تھااور شبنم پیرنی بن گئی تھی۔سوجس نے جودعا مانگنے کوکہا ہم نے دل سے مانگی۔دل بھی وہ جوابھی زیرومیٹر تھا۔

اگلے روز صبح سویرے ہم نے سامان اٹھایا اور ملتان جانے والی ٹرین میں سوار ہوگئے۔ہماری نشستیں میرے ایک دوست نے بک کروارکھی تھیں اوروہ رات ہی ٹکٹیں میرے حوالے کرگیا تھا۔ٹرین ملتان کےاسٹیشن پر پہنچی تو مجھے بہت سے جانے پہچانے لوگ دکھائی دیے،سب کے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار تھے۔اس سب کی مجھےتوقع نہ تھی۔میرا بھائی واجد اپنے بچوں کے ساتھ استقبال کے لیےآیا تھا۔شبنم کی بہن' بھائی اوران کے بچے بھی موجود تھے۔ان کا گھر چونکہ ریلوے سٹیشن کےقریب ہی ہے'اس لیے وہ سارے ہی چلے آئے تھے۔پلیٹ فارم پر مسافروں کا ہجوم تھا'اتنے ہجوم میں ہم دونوں ہار پہنے کھڑے تھےاورساری دنیا ہمیں دیکھ رہی تھی۔

واجد کے ساتھ گھر پہنچےتو میرے والد صاحب'والدہ محترمہ' بہن ناصرہ اوراس کے تینوں بیٹے احمد'طلحہ اورطلال پھولوں کے ہار لیے کھڑے تھے۔والدہ نے ہم دونوں کے لیے نوٹوں کے ہارمنگوار کھے تھے۔ہم دونوں کوانھوں نے اپنے ہاتھوں سے یہ ہار پہنائے۔مجھے پختہ یقین ہو چلا تھا کہ میں واقعی اس مُنصفِ اکبر کی عدالتِ اکبر سے بری ہوکر آیا ہوں۔خطاؤں کے داغ دھل گئے ہیں۔ہمارامُنصفِ اکبر کتنا غفورورحیم ہے کہ پہلی ہی پیشی پر سب کوبری کر دیتا ہے۔

عمرے پر جانے والوں کے لیے چند قیمتی مشورے

سفر کی روداد تو تمام ہوئی لیکن میں چاہتا ہوں کہ عمرے پر جانے والوں کے لیے کچھ مشورے درج کردوں جن پر عمل کر کے وہ کئی مشکلات سے بچ سکتے ہیں۔

☆......جانے سے پہلے حج یا عمرے کا کوئی سفرنامہ ضرور پڑھیں یا کسی اچھی تربیت گاہ سے عمرے کی تربیت حاصل کریں۔

☆......سعودی عرب پہنچ کر سعودی قوانین پر پوری طرح عمل کریں۔کئی لوگ اپنی لاعلمی یا کم علمی کی وجہ سے وہاں کسی قانونی پیچیدگی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مکے یا مدینے میں کسی جگہ پر پڑی ہوئی کوئی چیز بھولے سے بھی مت اٹھائیں۔جس کی ہوگی وہ خود تلاش کرتے ہوئے وہاں پہنچ جائے گا اور اٹھا لے گا۔آپ نے اٹھالی تو چوری کے الزام میں پکڑے جاسکتے ہیں۔

☆......عمرے کے ویزے پر عمرہ ہی کریں۔کچھ لوگ وہاں جا کر ملازمت یا کاروبار شروع کر دیتے ہیں۔بعض لوگ عمرے کا ویزا لے کر وہاں بھیک مانگتے ہیں اور اپنے ملک کو بدنام کرتے ہیں۔

☆......سعودی عرب میں ہر قدم پر احتیاط لازم ہے۔آپ کی ذرا سی بے احتیاطی آپ کو بڑی مشکل میں ڈال سکتی ہے۔اپنی رقم اور پاسپورٹ کا خاص خیال رکھیے۔اگر چہ رقم اور پاسپورٹ سے محروم ہو جانے والے پاکستانیوں کی مشکل آسان بنانے کے لیے بعض ادارے وہاں کام کر رہے ہیں لیکن اس کے باوجود احتیاط لازم ہے۔

☆......عمرے کے ویزے پر جانے والے لوگ سعودی عرب میں مقررہ مدت سے زیادہ ہرگز مت ٹھہریں۔

☆......عمرے کے لیے جاتے ہوئے اگر آپ کا کوئی جاننے والا آپ کو کوئی سامان سعودی عرب لے جانے کو کہے تو ہرگز مت لے کر جائیں۔اسے صاف جواب دے دیں۔ سعودی عرب سے آتے ہوئے بھی ایسا ہی رویہ اختیار کریں۔حتیٰ کہ اگر کوئی آپ کو بہت زیادہ رقم پاکستان سے سعودی عرب یا سعودی عرب سے پاکستان لے جانے کو کہے تو بھی انکار کردیں۔

☆......سعودی عرب پہنچ کر مکہ مکرمہ یا مدینہ منورہ ہی میں قیام کریں۔اگر آپ کا کوئی عزیز سعودی عرب کے کسی شہر میں رہتا ہو تو خود اسے ملنے ہرگز نہ جائیں۔کسی پولیس چیک پوسٹ پر پکڑے گئے تو آپ کسی بڑی مشکل میں پھنس سکتے ہیں۔البتہ اپنے عزیز کو مکہ مکرمہ یا مدینہ منورہ اپنے پاس بلا سکتے ہیں۔

☆......اگر آپ سرکاری ملازم ہیں اور آپ کا پاسپورٹ سرکاری ہے تو بیرونِ ملک رخصت کے ساتھ ساتھ این او سی ضرور حاصل کریں۔این او سی کے بغیر آپ کو جہاز میں سوار نہیں ہونے دیا جائے گا۔وفاقی ملازم اپنی وزارت سے اور صوبائی ملازم اپنے محکمے سے رخصت اور این او سی حاصل کرسکتے ہیں۔پنجاب حکومت نے بیرونِ ملک رخصت اور این او

سی کے لئے خفیہ پولیس یعنی سپیشل برانچ کی رپورٹ حاصل کرنے کی پابندی ختم کردی ہے۔ اب پنجاب کے سرکاری ملازمین اپنے محکمے سے نہایت آسانی کے ساتھ این او سی حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر آپ کا عمرہ پیکیج 14 دن کا ہے تو کم از کم 21 دن کی چھٹیاں لیں کیونکہ سعودی عرب سے آتے ہوئے آپ کی پرواز میں تاخیر بھی ہوسکتی ہے۔ ویسے بھی واپس آ کر رشتے داروں اور دوستوں سے میل ملاپ کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جس کے لیے دو چار دن کی فراغت درکار ہوتی ہے۔

☆......اپنے ہمراہ ہمیشہ پہیے والے بیگ لے کر جائیں۔ سعودی عرب میں آپ کو کئی بار اپنا سامان ادھر سے ادھر لے جانا پڑتا ہے۔ پہیے والے بیگ ہوں گے تو آسانی رہے گی۔

☆......آپ کے پاس جس ایئر لائن کا ٹکٹ ہو اس کی ویب سائٹ پر جا کر اس کی بیگج پالیسی ضرور دیکھیے اور جتنا سامان ساتھ لے جانے کی اجازت ہو اتنا ہی ساتھ لے کر جائیں۔ سعودی عرب سے آتے ہوئے خاص طور پر اس کا دھیان رکھیں۔ سامان زیادہ ہو تو ایئر لائن والے بھاری رقم طلب کرتے ہیں۔ جن لوگوں کے پاس رقم نہیں ہوتی انھیں اپنا زاید سامان وہیں چھوڑ کر آنا پڑتا ہے۔

☆......عمرہ زائرین کو مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے ہوٹلوں میں شیئرنگ روم میں ٹھہرایا جاتا ہے۔ ایک کمرے میں چار چار، پانچ پانچ لوگوں کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ اگر میاں بیوی عمرہ کرنے جا رہے ہوں تو پاکستان ہی میں اپنے عمرہ ایجنٹ سے کہیں کہ انھیں سعودی عرب میں الگ سے سنگل کمرہ دیا جائے۔

☆......سعودی عرب میں خریداری مدینہ منورہ میں کریں۔ مکہ مکرمہ کی نسبت مدینے میں چیزیں سستی ہیں۔ کھجور ہمیشہ مدینے کی کھجور مارکیٹ سے خریدیں۔

☆......چائے پینے کے شوقین خواتین و حضرات خشک دودھ، چینی اور ٹی بیگز ساتھ لے جا سکتے ہیں۔ گرم پانی عموماً ہوٹل میں مل جاتا ہے۔ اس کے باوجود آپ چاہیں تو چائے کے لیے پانی اُبالنے کے لیے بجلی کی کیتلی اپنے ہمراہ لے جا سکتے ہیں۔